رجسٹرڈ نمبر آصفیہ ۱۲۰
رجسٹرڈ نمبر ایم ۲۹۵۰

جلد (۸) عدد (۴)
ربیع الثانی ۱۳۵۵ ہجری

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (عہ)

قیمت فی پرچہ ۵ر

الجہاد فی الاسلام

(تالیف)

ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام کے جن مسائل پر مخالفین نے سب سے زیادہ حملے کئے ہیں اُن میں سے ایک مسئلہ جہاد بھی ہے اس مسئلہ پر ایسی شدومد کے ساتھ اعتراضات کیے گئے کہ بہت سے مسلمان بھی ان سے مرعوب ہوگئے اور انہوں نے دشمنوں کے اعتراضات کو رفع کرنے کے لیے خود اسلام کے احکام اور اس کی تعلیمات میں قطع وبرید شروع کردی۔ اسلام کے حامیوں کی جانب سے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا وہ سب معذرت Apology کے انداز میں تھا جس سے صریح کمزوری اور مرعوبیت ظاہر ہوتی تھی مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد نے البتہ اس مسئلہ کو صاف کرنے کی کوشش کی مگر پورا پورا حق ان کی تحریروں سے بھی ظاہر نہیں ہوا۔ ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب اس موضوع پر لکھی جاتی جس میں جنگ کے متعلق اسلام کی تعلیم اور اس کے مقاصد اور احکام کو تفصیل کے ساتھ صاف صاف بیان کردیا جاتا، اور دوسرے مذاہب اور قوموں کے اصول وقوانین جنگ سے مقابلہ کرکے ثابت کیا جاتا کہ اسلام کا جہاد اپنے مقاصد اور قواعد وضوابط کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

الجہاد فی الاسلام نے اسی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب معذرت کے انداز میں نہیں بلکہ اظہار حق کے انداز میں لکھی گئی ہے اور ضمناً اس میں ہندو مذہب، بودھ مت، مسیحیت، یہودیت اور قانون بین الاقوام International law پر ایسے مباحث بھی آگئے ہیں جو ابھی تک اردو زبان کے لیے بالکل نئے ہیں عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب صرف اردو بلکہ کسی مشرقی یا مغربی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

ضخامت (۵۰۰) صفحات قیمت [illegible] بلا جلد ([illegible]) انگریزی ([illegible]) سکہ عثمانیہ (مجلد کی قیمت [illegible] انگریزی [illegible] سکہ عثمانیہ)

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے

(یہ کتاب مکتبہ علمیہ چارمینار سے بھی مل سکتی ہے)

فہرست مضامین

ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۳۵۵ھ جلد ۵ عدد ۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

چند مہینوں سے اس رسالہ کے بیشتر صفحات، اور مرتب رسالہ کے تمام تر اوقات کو بعض اہم شرعی مسائل نے گھیر لیا ہے، جس کی وجہ سے اُن استفسارات کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا جو وقتاً فوقتاً باہر سے آتے رہے ہیں۔ خود مستفسرین کو بھی اس کا احساس ہے کہ جن مسائل پر اس وقت بحث ہو رہی ہے وہ زیادہ اہم ہیں۔ اسی لیے انہوں نے عدم توجہ کی شکایت نہیں کی۔ مگر اس مشغولیت کا سلسلہ نہ معلوم کب تک جاری رہے، لہٰذا تفصیلی تحقیق کا خیال چھوڑ کر اشارات میں ان شکوک کو رفع کرنے کی کوشش کی جائیگی۔

سورۂ نمل کے دوسرے اور تیسرے رکوع میں ملکۂ سبا اور حضرت سلیمانؑ کا ذکر آیا ہے۔ اس کا مختصر بیان یہ ہے کہ آنحضرت علیہ السلام کو جب "ھدھد" کے ذریعہ سے قوم سبا کے شرک اور ان کی آفتاب پرستی کا حال معلوم ہوا تو آپ نے اس قوم کی ملکہ کو اسلام کی طرف دعوت دی۔ ملکہ نے اس باب میں اپنے امرا و اعیان سلطنت سے مشورہ لیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم بھی زور باز و رکھتے ہیں۔ جنگ کیے بغیر اطاعت نہ کریں گے۔ مگر ملکہ نے جنگ کی رائے سے اتفاق نہ کیا اور اس کے بُرے نتائج سے آگاہ کر کے مصالحانہ روش اختیار کرنے کی رائے دی۔ چنانچہ سب کے اتفاق سے ایک بیش قیمت ھدیہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت

میں بھیجا گیا۔ حضرت سلیمانؑ نے فرمایا کہ مجھے تمہارے ہدیے کی ضرورت نہیں، میں تمہارے اسلام یا اطاعت کا طالب ہوں۔ غرض جنگ کا اعلان ہوگیا۔ اس اعلان کے بعد آنحضرت اپنے اعیان دولت کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ تم میں کون ہے جو اس ملکہ کا تخت میرے پاس اٹھا لائے۔ ایک جن نے عرض کیا کہ میں دربار کے برخاست ہونے سے پہلے اُس کو لے آؤں گا۔ ایک دوسرے شخص نے جو "کتاب کا علم رکھتا تھا" کہا کہ میں چشم زدن میں اس کو حاضر کیے دیتا ہوں۔ چنانچہ اس نے فی الواقع پلک جھپکاتے تخت لا حاضر کیا۔ اس موقع پر حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ موضح القرآن میں لکھتے ہیں:۔

"کافر جو اپنے ایمان میں نہیں اس کا مال زبردستی حلال ہے جب وہ مسلمان ہوا پھر حلال نہیں"۔

پھر جب حضرت سلیمان نے ملکہ کو اپنے سامنے حاضر پایا تو بے اختیار بول اٹھے کہ یہ میرے رب کا فضل ہے۔ وہ مجھ کو آزماتا ہے کہ میں شاکر بندوں کی طرح اس کی نعمتوں کا ٹھیک ٹھیک حق ادا کرتا ہوں، یا کافروں کی طرح کفران نعمت کرتا ہوں۔ یہاں حضرت مرحوم نے پھر شرح فرماتے ہوئے لکھا ہے:۔

"یعنی ظاہر کے اسباب سے نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ میرے رفیق اس درجہ کو پہنچے جن سے کرامت ہونے لگی ...... اور اس کے پاس ایک علم تھا کتاب کا یعنی اللہ کے اسماء، اور کلام کی تاثیر کا وہ شخص آصف تھا ان کا وزیر"

آیات مذکورۂ بالا اور ان کے متعلق حضرت شاہ صاحب رح کے حواشی پر ایک عزیز نے حسب ذیل شبہات ظاہر کیے ہیں۔

(۱) ایک جلیل القدر پیغمبر کسی دوسرے کی ملک پر بلا ضرورت کیوں تصرف کرنے لگے اگر ملکۂ سبا کو کسی معجزہ سے مرعوب ہی کرنا تھا (حالانکہ یہ بات کسی پیغمبر کے بس کی نہیں) تو کسی اور طریقہ سے مرعوب کرتے جو جائز اور حلال ہوتا نہ کہ اس طرح سے۔ فرض کیا کہ کافر کا مال مباح ہے۔ مگر پیغمبر کا تقویٰ اس سے بالاتر ہے کہ وہ مباحات کے ادنیٰ مراتب سے استفادہ کرے۔

(۲) اسم اعظم وغیرہ کا تخیل نہ صرف غیر شرعی بلکہ جاہلانہ تخیل ہے۔ پھر پیغمبر یا ان کے مصاحبوں کا ایسا فعل کیونکر لائق تحسین ہو سکتا ہے۔

(۳) ملکۂ سبا کا تخت اٹھا منگانا حضرت سلیمان کا معجزہ نہیں ہوا۔ بلکہ ان کے ایک مصاحب کی کرامت ہوئی جو پیغمبر شیاطین اور اجنّہ تک کو مسخر کر سکتا ہے وہ کیا آن کی آن میں اپنی قوت اعجاز سے تخت نہیں لا سکتا۔

(۴) توریت اور تالمود میں جہاں انبیاء بنی اسرائیل کے مفصل سوانح حیات مذکور ہیں کوئی تذکرہ اس قسم کا نہیں پایا جاتا۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ اسلام نہ تو حکومت خود اختیاری (سلف گورنمنٹ) کا قائل ہے، اور نہ جہانگیری (امپیریلزم) کا، بلکہ اس کا نظریۂ سلطنت تمام دنیا کے نظریات سے مختلف ہے، اور جذبات و خواہشات نفس کے بجائے خالص عقلی اصول پر اس کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس نظریہ کا لب لباب یہ ہے کہ زمین کی حکومت صرف صالحین کا حق ہے، اور مرد صالح وہ ہے جس کے پاس خدا کا بخشا ہوا علم، اور خدا کی دی ہوئی طاقت ہو۔ جو اس علم اور طاقت کو خدا کے قانون کی صحیح پیروی میں استعمال کرتا ہو۔ جس کے پیش نظر اپنے نفس

یا اپنی قوم کا مفاد نہیں بلکہ کل نوع انسانی کا اخلاقی، روحانی اور مادی فائدہ ہو۔ ایسا شخص کسی ایک قوم کی میراث نہیں بلکہ تمام نوع کی مشترک میراث ہے، اور اسی کو یہ حق پہنچتا ہے، اور اسی پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ تمام دنیا میں خدا کے قانون کی حکومت قائم کرے، اور خدا کے بندوں کو ظالموں کی حکومت اور ظالمانہ قوانین کی جکڑ بندی سے نجات دلائے۔ اس کے مقابلہ میں وہ لوگ جن کے پاس نہ الٰہی ہدایت ہے، نہ الٰہی قانون ہے، نہ ایسی طہارت نفس ہے کہ خود غرضی اور تکبر سے بالاتر ہو کر خالص مفاد عام کی خدمت کے لیے حکومت کریں، ہرگز اس کا حق نہیں رکھتے کہ حکومت و سلطنت کی باگیں ان کے ہاتھوں میں رہیں۔ وہ خواہ اپنی قوم پر حاکم ہوں یا غیر قوموں پر، بہر حال وہ ظالم ہیں، اور صالح کو حق پہنچتا ہے کہ اگر طاقت اس کے ہاتھ میں ہو تو ان سے حکومت چھین لے۔ ایسے لوگوں کو سب سے پہلے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جائے گی۔ اگر انہوں نے مان لیا اور قانون الٰہی کے متبع بن گئے تو وہ بھی صالحین کے گروہ میں آجائیں گے اور حسب صلاحیت ان کو حکومت میں حصہ لینے کا حق مل جائے گا۔ اور اگر انھوں نے انکار کیا تو وہ حاکم بن کر نہیں رہ سکتے ان کو طاقت سے مغلوب کر کے ان کی حکومت مٹا دی جائے گی، اور انہیں اسلام کے سیاسی قوانین کا تابع بن کر رہنا پڑے گا، تاکہ وہ کم از کم خدا کی زمین میں شر و فساد نہ پھیلا سکیں۔ باقی رہا ان کا شرک و کفر تو اس کی سزا ان کو خود اللہ تعالیٰ قیامت کے روز دیگا۔ دنیا میں ان کو یہ آزادی حاصل رہے گی کہ جس اعتقاد اور جس مذہب کی چاہیں پیروی کریں۔

اس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کے طرز عمل کو ملاحظہ کیجئے۔ وہ اللہ کے پیغمبر ہیں اللہ نے ان کو علم عطا کیا ہے (وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ عِلْمًا۔ النمل ۲) ان کو طاقت

اور عمل صالح کے اعتبار سے نہ صرف کفار پر بلکہ عام مومنین پر بھی برتری عطا فرمائی ہے۔ (الحمد للہ الذی فضلنا علی کثیر من عبادہ المؤمنین۔ النمل۔ ۲)۔ ان میں وہ تمام اوصاف جمع ہیں جن کی بنا پر قانون الٰہی کے مطابق ایک شخص حکمرانی کا سب سے زیادہ حق دار ہوتا ہے۔ (إِنَّ اللهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ۔ البقرہ ۳۲) خود ان کے پدر گرامی قدر حضرت داؤد علیہ السلام کو جو کتاب حق تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی اس میں یہ قاعدہ کلیہ مقرر کر دیا گیا تھا کہ زمین کی حقیقی وراثت صرف صالحین کو پہنچتی ہے، یعنی جو صالح نہیں ہیں وہ حکومت کے جائز حق دار نہیں بلکہ غاصب ہیں (وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ۔ الانبیاء۔ ۷)۔ اب ان کو خبر ملتی ہے کہ ایک قوم آفتاب کی پرستار، شیطان کی متبع اور راہ راست سے ہٹی ہوئی ہے (يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِن دُونِ اللَّهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ۔ النمل۔ ۲)۔ قاعدہ اسلامی کے مطابق حضرت سلیمان اس کو دعوت دیتے ہیں کہ یا اسلام قبول کرو یا حکومتِ صالحہ کے مطیع ہو جاؤ کیونکہ شیطانی طریقہ کے پیرو رہتے ہوئے تم کو حکومت کا حق نہیں، عام اس سے کہ تمہاری حکومت خود اختیاری ہو یا جہانگیرانہ (أَلَّا تَعْلُوا عَلَيَّ وَأْتُونِي مُسْلِمِينَ۔ النمل: ۲)۔ اس قوم کی ملکہ اس نامۂ گرامی کو دیکھ کر ایمان کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ (وَأُوتِينَا الْعِلْمَ مِن قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِينَ۔ النمل: ۳)۔ مگر قومی عصبیت اور دین آبائی کی محبت اس کو ایمان لانے سے روک دیتی ہے (وَصَدَّهَا مَا كَانَت تَّعْبُدُ مِن دُونِ اللَّهِ إِنَّهَا كَانَتْ مِن قَوْمٍ كَافِرِينَ (النمل ۳)۔ اپنی سلطنت کے امرا و اعیان سے رائے لیتی ہے، وہ لڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ملکہ ان کو روکتی ہے

اور حضرت سلیمان کو ہدیہ بھیج کر راضی کرنا چاہتی ہے، لیکن حضرت سلیمان اس پیشکش کو رد فرما دیتے ہیں، اس لیے کہ وہ دنیوی بادشاہوں کی طرح نہ تھے جن کا مقصود محض مال و دولت ہوتا ہے بلکہ وہ خدا کی طرف سے اس کام پر مامور تھے کہ لوگوں کو دین الٰہی کا پیرو بنائیں یا کم از کم ان حکومتوں کو جو عصیان و طغیان پر قائم ہوں، مٹا کر الٰہی قانون کی حکومت قائم کردیں۔ اس غرض کے لیے وہ اعلان جنگ کر دیتے ہیں اور ایک فوج ملک سبا کی طرف بھیجتے ہیں۔ اب ان کی پیغمبرانہ حکمت اس امر کی مقتضی ہوتی ہے کہ ملکہ کے گرفتار ہو کر آنے سے پہلے اس کا تخت اٹھوا منگائیں۔ اس کی مصلحت یہ تھی کہ اصل مقصود ملک فتح کرنا نہ تھا بلکہ اس ملکہ اور اس کی قوم کو مسلمان کرنا تھا۔ فوج کی چڑھائی سے ملک کا مسخر ہو جانا تو یقینی تھا، مگر اس امر کا یقین نہ تھا کہ محض افہام و تفہیم سے یہ لوگ اس مشرکانہ مذہب کو چھوڑ دیں گے جس پر صدیوں سے وہ اور ان کے آباؤ اجداد جمے ہوئے تھے۔ اس غرض کے لیے خدائی طاقت کے ایک مظاہرہ کی بھی ضرورت تھی تاکہ وہ اپنے معبود کی بے بسی اور خدائے واحد کی قدرت بے پایاں کا ایک ادنیٰ کرشمہ بچشم سر دیکھ لیں۔ چنانچہ تخت منگا لیا گیا اور جب ملکہ حاضر ہوئی تو اس کے سامنے بالکل انجان بن کر پیش کیا گیا۔ (قَالَ نَكِّرُوا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ أَتَهْتَدِي أَمْ تَكُونُ مِنَ الَّذِينَ لَا يَهْتَدُونَ۔ النمل ۳) ملکہ نے تخت کو دیکھا تو پہچان گئی اور اب وہ ایمان جو حضرت سلیمان کی پہلی دعوت پر محض ایک جھلک دکھا کر غائب ہو گیا تھا، اپنی پوری روشنی کے ساتھ اس کے دل میں اتر گیا۔ (وَقَالَتْ كَأَنَّهُ هُوَ وَأُوتِينَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِينَ۔

اس تشریح سے یہ شبہہ رفع ہو جاتا ہے کہ ایک جلیل القدر پیغمبر نے "دوسرے کی

ملک پر "بلاضرورت" تصرف کیا۔ وہ ملک خدا کی تھی۔ دوسرا اس پر حق کی راہ سے نہیں ظلم اور غصب کی راہ سے قابض تھا، قانون الٰہی کے مطابق اس کو بے دخل کر دینے کی ضرورت تھی تاکہ وہ یا تو قانون الٰہی کا اتباع قبول کرے یا کم از کم دنیوی امور میں حکومت صالحہ کا مطیع ہو جائے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدا پرستی، اور نفسانی اغراض سے پاکیزگی کا کمال تو دیکھیے۔ مال و دولت کو یہ کہکر ٹھکرا دیتے ہیں کہ میرے خدا نے جو کچھ مجھکو دیا ہے وہ تمہارے مال سے بہتر ہے۔ مخالف قوم کی ملکہ کا تخت جب آن کی آن میں اپنے قدموں کے نیچے دیکھتے ہیں تو اپنی طاقت و شوکت کی تعریف میں ایک حرف بھی زبان پر نہیں آتا۔ زبان کھلتی ہے تو اپنے پروردگار کے فضل و احسان کی تعریف میں اور سر جھکتا ہے تو اپنے آقا کے شکریہ میں۔ جو وقت ایک بادشاہ کے لیے انتہائی فخر و مباہات کا تھا اس وقت یہ عجز و نیاز! یہ شکر و سپاس! پھر سبا کی ملکہ مغلوب ہو کر آتی ہے تو اس کے ملک کا کوئی حصہ نہیں مانگا جاتا اس سے تجارتی اور معاشی امتیازات طلب نہیں کیے جاتے۔ اس پر انتداب (مینڈیٹ) یا حمایت (پروٹیکٹوریٹ) قائم کرنے کی تجویز نہیں کی جاتی اس کے ان ریزیڈنسی اور ہائی کمشنری قائم کرنے کا ذکر بھی درمیان میں نہیں آتا۔ پیش کیا جاتا ہے اس کے سامنے کلمۂ حق۔ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشان (یعنی خود اس کا تخت) اس کو دکھایا جاتا ہے تاکہ اس کی ہدایت ہو۔ اس معجزہ کو دیکھ کر ادھر اس کی زبان پر یہ کلام جاری ہوتا ہے کہ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ اور ادھر بادشاہ اسلام مطمئن ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کا مقصد پورا ہو گیا۔ وہ اپنی ذات یا قوم کے لیے کسی چیز کا طالب نہ تھا۔ اس کو تو صرف اس بات کی لگن لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح ان کے دین اور دنیا کو خرابی سے بچا لے جن فرمانروائی

یہ نیت ہو جس کا یہ طرزِ عمل ہو، اگر وہ زمین کی حکومت کا جائز وارث نہیں تو اور کون ہو سکتا ہے۔

جائز اور حلال کی بحث تو آپ ہی آپ طے ہو گئی پیغمبر کا تقویٰ اُس سے بھی بڑھ کر نکلا جس کا تصور کیا جا سکتا تھا۔ کافر کا مال لوٹنا تو درکنار، اس کا مال اسی کو سونپا اور اپنے پاس سے سب سے زیادہ قیمتی دولت اس پر اضافہ کی معجزے سے مرعوب کرنے کی حکمت و مصلحت بھی ظاہر ہو گئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس معجزانہ قوت کو اللہ کے دیئے ہوئے علم سے، اللہ ہی کے کام میں خالص اور پاک نیت کے ساتھ استعمال کیا گیا' لہٰذا اس میں نہ کوئی چیز جاہلانہ ہے، نہ خلافِ شرع اور نہ قابلِ نکیر اب صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ حضرت سلیمان کے بجائے اس معجزہ کا صدور ایک دوسرے شخص کے ذریعہ سے کیوں کرایا گیا؟ یہ ظاہر ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو یہی کام خود آنحضرت علیہ السلام سے بھی لے سکتا تھا۔ مگر جب اسنے ان کے بجائے ایک دوسرے شخص کو اس کے لیے انتخاب کیا تو ضرور ہے کہ اس میں بھی کوئی مصلحت ہو۔

میں یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا، مگر غور کرنے سے جو مصلحت میری سمجھ میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں جِن کی قوتِ ناریہ اور انسان کی قوتِ علمیہ کا فرق ظاہر کرنا مقصود تھا۔ انسان اگرچہ قیدِ جسمانی میں رہ کر اپنی محدود مادی طاقت سے کوئی فوق العادہ کام نہیں کر سکتا، اور اس حیثیت سے جن کا وجودِ ناری اس کے وجودِ خاکی سے بہت زیادہ قوی ہے، لیکن جب علمِ کتاب کی قوت انسان کے ساتھ ہو تو وہ تمام طاقت والوں سے بڑھ کر طاقتور ہو جاتا ہے۔ اس قوتِ علمیہ کا مظاہرہ اگر پیغمبر کے ذریعہ سے کرایا جاتا، تو اس شبہ کی گنجایش نکل سکتی تھی کہ پیغمبر تو جن و انس میں سب سے افضل ہے ہی۔ اس کی فوقیت اگر ثابت ہو گئی تو اس سے بشر من حیث البشر کا علمی تفوق ظاہر نہیں ہوا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک معمولی غیر نبی انسان سے اس علمی طاقت کا مظاہرہ کرا دیا تاکہ حقیقت بالکل

عیاں ہوجائے۔ ادنیٰ شبہہ بھی باقی نہ رہے۔

توریت اور تالمود میں یہ قصہ کیوں نہیں ہے؟ اس کا جواب آپ کو قرآن اور توریت کے تقابل سے خود مل جائیگا توریت تاریخی افسانوں کی ایک کتاب بن کر رہ گئی ہے جس میں غیر ضروری تفصیلات بہت ملیں گی مگر بہت ہی کم کوئی ایسی چیز پائی جائے گی جو اپنے اندر کوئی حکمت، کوئی موعظت، کوئی دینی، اخلاقی، شرعی یا سیاسی سبق رکھتی ہو۔ بخلاف اس کے قرآن میں تمام غیر ضروری تفصیلات کو چھوڑ کر انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں کا عطر نکال لیا گیا ہے اور صرف وہ چیزیں پیش کی گئی ہیں جو ہر زمانے اور ہر قوم کے انسانوں کے لیے اپنے اندر بے حد و حساب ہدایتیں رکھتی ہیں۔ بے کار تاریخی جزئیات توریت میں بہت ہیں اور قرآن میں کہیں نہیں۔ سبق آموز واقعات تمام تر قرآن میں بیان ہوئے ہیں، توریت میں اکثر و بیشتر تو ملتے ہی نہیں اور اگر ملتے ہیں تو ان کو خشک اور غیر تعلیمی انداز بیان سے اس درجہ مسخ کر دیا گیا ہے کہ قلب پر ان کا کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ بات یہیں تک نہیں، اس سے بھی زیادہ افسوسناک یہ ہے۔ متعدد پیغمبروں کی زندگیوں کو توریت اور دوسری اسرائیلی روایات میں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ ان کو پیغمبر ماننا تو درکنار، کوئی اعلیٰ درجہ کا شریف انسان تسلیم کرنا بھی مشکل ہے۔ یہ فخر صرف قرآن کو حاصل ہے کہ اس نے انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں کو ان اسرائیلی نجاستوں سے پاک کیا ہے، اور از سر نو دنیا میں ان پاک شخصیتوں کی وہ عظمت و حرمت قائم کی ہے جس کے وہ دراصل مستحق تھے۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت داؤد اور حضرت سلیمانؑ کے حالات توریت میں پڑھیے، کتنے ہی سیاہ دھبے آپ کو وہاں نظر آئیں گے۔ قرآن میں دیکھیے۔ آسمان عز و شرف کے چمکتے ہوئے مہ و انجم دکھائی دیں گے۔ خود حضرت سلیمان کو اسرائیلیات میں نبوت کیا معنی ایمان سے بھی محروم کر دیا گیا ہے۔ نعوذ باللہ وہ کافر، بت پرست اور جادوگر

حیثیت سے پیش کیے گئے ہیں۔ قرآن ہی وہ کتاب ہے جس نے دنیا کو بتایا کہ وہ اعلیٰ درجہ کے مومن اور اللہ کے جلیل القدر پیغمبر تھے۔

بنی اسرائیل کا مذاق اخلاقی و روحانی معاملات میں کچھ اس درجہ پست واقع ہوا تھا کہ انہوں نے نہ صرف اپنی کتابوں میں خود اپنے انبیاء کی سیرتوں کو جھوٹے افسانوں سے داغدار بنایا، بلکہ جب قرآن مجید نے ان کے ملکات فاضلہ و اخلاق حسنہ اور ان کے بلند پایہ کارناموں کی صحیح تصویر کھینچی تو ان کو یقین نہ آیا کہ انسانی سیرت اتنی پاکیزہ بھی ہوسکتی ہے، بشری اخلاق اتنے بلند بھی ہوسکتے ہیں، آب و گل کے بنے ہوئے آدمی اس قدر پاک نفس عالی حوصلہ اور فانی فی اللہ بھی ہوسکتے ہیں! ان کے تصور سے یہ چیزیں بہت بالا و برتر تھیں اسی لیے نزول قرآن کے بعد اسرائیلی مذاق کی کارفرمائی پھر شروع ہوگئی قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے جو قصے بیان ہوئے ہیں ان میں سے ایک ایک پر ہاتھ صاف کیا گیا اور ہر ایک کی جان نکال لی گئی۔ قرآن کا انداز بیان یہ ہے کہ وہ قصوں کی غیر ضروری تفصیلات کو چھوڑ کر صرف کام کی باتیں لے لیتا ہے اس طرح واقعات کے درمیان جو خلا چھوٹ جاتا ہے اس کو پڑھنے والا خود اپنے تصور یا بیرونی معلومات سے (اگر ہوں تو) بھر سکتا ہے مگر اسرائیلی مذاق رکھنے والوں نے اس خلا کو افسانوں سے پر کیا اور افسانے بھی ایسے پست او رذی کہ ان کے ساتھ مل کر اصل قصے کی تعلیم ہی باطل ہوگئی بدقسمتی سے قصص القرآن کی تفسیروں میں یہی اسرائیلیات کثرت سے راہ پا گئے ہیں، اور قرآن کا مطالعہ کرنے والوں کو اکثر شبہات انہی کی وجہ سے پیش آتے ہیں۔

اسی قصۂ سلیمانؑ و ملکۂ سبا کو دیکھ لیجیے قرآن کے صاف اور سادہ بیان میں حضرت سلیمان کی سیرت پاک کا کتنا اچھا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ مگر اسرائیلی مذاق کی کارفرمائی نے اس کی اہم خصوصیات میں سے ایک ایک کو مٹا کر چھوڑا، اور اسکو اپنے بلند مقام سے گرا کر ایسی پستی میں پھینک دیا کہ اس میں کوئی تعلیمی روح باقی ہی نہ رہی، بلکہ پڑھنے والا اگر اس روشنی میں اس قصے کو پڑھے تو اس کو تعجب ہوگا کہ قرآن میں اس قصہ کی ضرورت ہی کیا تھی۔

ملکۂ سبا کے ہدیے کو واپس کرنے کی وجہ اوپر بیان ہوچکی ہے۔ مگر اسرائیلی مذاق نے اس کی جو توجیہ کی ہے وہ بھی ملاحظہ ہو۔ ملکہ نے جینے

نے دو سو غلاموں اور دو سو لونڈیوں کو ایک سا لباس پہنا کر بھیجا تھا جس میں تمیز نہ ہوتی تھی کہ غلام کون ہے اور لونڈی کون۔ وہ اس سے حضرت سلیمان کی عقل کا اندازہ کرنا چاہتی تھی۔ حضرت سلیمان کے پاس یہ جماعت پہنچی تو انہوں نے لونڈیوں کو الگ اور غلاموں کو الگ کر دیا اور کہا کہ ان کو لے جاؤ، ایسا ہدیہ تمہیں کو مبارک رہے۔ اس توجیہ کے بعد حضرت سلیمان کے جواب پر نظر ڈالیے کیا اب بھی اس میں کوئی جان، کوئی بلند اخلاقی روح پائی جاتی ہے؟

تخت اٹھوا کر منگانے کی مصلحت بھی آپ کو اوپر معلوم ہو چکی ہے۔ اب ذرا اس توجیہ کو بھی دیکھیے جو اسرائیلیات کے زیر اثر گھڑی گئی ہے۔ ہدہد نے حضرت سلیمان سے سبا کے تخت شاہی کی بڑی تعریف کی تھی۔ سارا تخت سونے اور بیش قیمت جواہرات کا بنا ہوا ہے۔ کاریگری کا عجیب نمونہ ہے۔ ایک بے بہا چیز ہے۔ حضرت سلیمان ان تعریفوں کو سن کر بے تاب ہو گئے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ فوج ملکہ سبا اور اس کے اعیان سلطنت کو لیے آتی ہے تو انھیں خیال ہوا کہ اگر یہ لوگ مسلمان ہو گئے یا انھوں نے اطاعت قبول کر لی تو پھر یہ چیز ہاتھ نہ آسکے گی۔ لہٰذا انہوں نے حکم دیا کہ ان کے آنے سے پہلے تخت یہاں لے آؤ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ کہاں وہ پاک نیت اور کہاں یہ طمع و حرص۔ کس بلندی سے کس پستی میں اس واقعہ کو پھینکا گیا ہے۔

تخت کو ملکہ کے سامنے پیش کرنے کا مقصد یہ بتانا تھا کہ تو جس متاع عزیز کو قفلوں میں بند کر کے بڑے چوکی پہروں میں رکھ آئی تھی وہ یہاں حاضر ہے۔ یہ الٰہی علم کی طاقت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے اور تیری آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ دلائل عقلی کے ساتھ اس دلیل مادی کو محض اس لیے پیش کیا گیا تھا کہ کسی طرح اس عورت کو ہدایت نصیب ہو جائے تو حضرت سلیمان نے اس فعل کی غرض یہی بتائی ہے کہ ننظر أتهتدي أم تكون من الذين لا يهتدون۔ مگر ایسی کھلی ہوئی بات بھی افسانہ طلب حضرات کے ذہن کی رسائی سے بالاتر ثابت ہوئی۔ انہوں نے تخت کو پیش کرنے کی توجیہ یہ کی کہ حضرت سلیمان اس کی عقل کا امتحان لینا چاہتے تھے اس لیے تخت کی ساخت میں کچھ ترمیم کرا دی اور اس کے سامنے رکھوا دیا تاکہ دیکھیں کہ وہ اس کو پہچانتی ہے یا نہیں! انبیاء کے کاموں کو جب عامیانہ نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے تو وہ اسی طرح بلند مقاصد اور اعلیٰ درجہ کے مصالح و حکم سے خالی نظر آتے ہیں۔

سب سے زیادہ رکیک بات جو اس سلسلہ میں کہی گئی ہے وہ شیش محل میں ملکہ سبا کی حاضری سے متعلق ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ حضرت سلیمان نے ملکہ کے سامنے اس کا تخت پیش کرنے کے بعد اسے اپنا شیش محل دکھایا جس کا فرش بھی شیشے یا بلور کا تھا۔ ملکہ جب وہاں پہنچی تو شیشے کے فرش کو پانی سمجھ کر اپنے پائنچے اٹھانے لگی۔ حضرت سلیمان نے کہا کہ یہ شیشے کا فرش ہے! اب ملکہ کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں اس کے دل نے گواہی دی کہ جس شخص کے پاس اتنی بڑی سلطنت ہے، اتنی دولت ہے، اس قدر اسباب عیش و نعمت ہیں، ایسی غیر معمولی طاقتیں ہیں کہ چشم زدن میں خود میرا تخت ہزاروں میل سے اٹھوا منگاتا ہے، اور پھر ان سب چیزوں کے باوجود اس کے اخلاق، اس کی طہارت نفس، اس کے تقویٰ اور خلوص و للٰہیت کا یہ حال ہے وہ یقیناً ایک سچا آدمی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اس کے دعوے نبوت کی تکذیب کی جائے! اسی لیے بے اختیار وہ بول اٹھی کہ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ اے میرے پروردگار میں نے اپنے اوپر ظلم کیا کہ اب تک تجھے چھوڑ کر آفتاب کی پرستش کرتی رہی۔ اب میں سلیمان کے ساتھ اس اللہ کی پرستش کرتی ہوں جو سارے جہاں کا رب ہے۔

اب ذرا اسرائیلی مذاق کی تفسیر دیکھیے جو شیاطین اور جن حضرت سلیمان کے تابع فرمان تھے انہیں خوف ہوا کہ حضرت سلیمان ملکہ سبا سے شادی نہ کر لیں۔ اس لیے انہوں نے کہا کہ یہ عورت ایک جنی عورت کے پیٹ سے ہے اور اس کے پاؤں انسان کے سے پاؤں نہیں ہیں بلکہ گدھے کے کھر ہیں۔ حضرت سلیمان نے اس بیان کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے حکم دیا کہ ایک شیش محل بنایا جائے جس کا فرش بھی شیشے کا ہو اور فرش کے نیچے پانی بھر دیا جائے۔ مقصد یہ تھا کہ ملکہ جب اس میں داخل ہوگی تو پانی دیکھ کر اپنے پائنچے اٹھائے گی اور یوں اس کی پنڈلیاں دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔ یہ ایک نبی کا قصہ ہے یا کسی نفس پرست و دنی الطبع بادشاہ کا؟

یہ چند نمونے ہیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسرائیلی مذاق اور اسرائیلی ذہنیت نے توریت کی تعلیمات کو مسخ کرنے کے بعد قرآن کی تعلیمات کو بھی مسخ کرنے، اور انبیاء علیہم السلام کی پاک زندگیوں پر اپنے تخیل کے سیاہ دھبے ڈالنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی مگر خدا کا شکر ہے کہ اس نے قرآن کو اپنی اصلی صورت میں محفوظ کر دیا جس کی طرف رجوع کر کے ہر حق جو اور حق شناس انسان صحیح سبق اور صحیح علم حاصل کر سکتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص قرآن کی موجودگی میں بھی اسرائیلیات سے شغف رکھے اور توریت و تالمود ہی کو قرآن کی تعبیر و تفسیر کا ذریعہ سمجھتا ہے تو یہ اس کی اپنی غلطی ہے،

مقالات

بشارات الانبیاء

نبوت محمدی کے متعلق انبیاء سابقین کی پیشگوئیاں

(۴)

از جناب مولوی فضل حق صاحب

چوتھی بشارت

کتاب پیدائش، باب ۱۷، آیت ۲۰ میں اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ان کے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کے حق میں یہ وعدہ فرماتا ہے:-

"اور اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری سنی دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کرونگا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا"۔

آخری فقرے کا ترجمہ ۱۸۴۴ء کے عربی ترجمہ میں یہ کیا گیا ہے واجعلہ لشعبٍ کبیرٍ (یعنی میں اس کو ایک بڑی قوم کے لیے بناؤں گا) بعد کے جدید ترجمہ میں اس کو اجعلہ امۃً کبیرۃً کر دیا گیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ اشارہ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کیونکہ اولاد اسمٰعیل میں آپ کے سوا کوئی ایسا نہیں جس نے ایک بڑی قوم بنائی ہو، آپ سے پہلے بنی اسمٰعیل کوئی ایک قوم نہ تھے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی وہ دعا نقل فرمائی ہے جو انہوں نے

حضرت اسمٰعیل کے حق میں کی تھی اور وہ یہ ہے۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (البقرہ : ۱۵)۔

امام قرطبی اپنی کتاب کے حصہ دوم فصل اول میں لکھتے ہیں۔ بعض خبردار لوگ جو یہودیوں کی زبان میں مہارت رکھتے ہیں۔ اور جنہوں نے ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے کہتے ہیں کہ تورات کی اس عبارت میں دو مقامات پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی اعداد کے طریق پر نکلتا ہے، جو یہودیوں میں مستعمل ہے۔

(۱) "میں اسے بہت بڑھاؤں گا" یہاں اصل لفظ جو استعمال کیا گیا تھا "بماد ماد" ہے ان حروف کے اعداد ۹۲ ہیں۔ اسی طرح لفظ محمدؐ کے اعداد بھی ۹۲ ہیں۔

(۲) لشعب کبیر۔ اصل میں "لغوی غدادل" تھا۔ یہودیوں کی ابجد میں حرف غَ کے عدد تین ہیں۔ (کیونکہ غ ان کے ہاں ج کی جگہ پر ہے) اس لحاظ سے ان الفاظ کے مجموعی اعداد بھی وہی ۹۲ ہیں۔

احبار یہود میں سے ایک شخص عبدالسلام تھا جو سلطان بایزید مرحوم کے زمانے میں مسلمان ہوا۔ اس نے ایک چھوٹا سا رسالہ الرسالۃ الھادیۃ کے نام سے لکھا ہے۔ اس میں کہتا ہے، کہ احبار یہود میں حروف ابجد سے دلائل و اشارات نکالنے کا قاعدہ عام طور پر رائج تھا۔ جب حضرت سلیمان نے بیت المقدس تعمیر کیا تو احبار یہود جمع ہوئے اور کہا کہ یہ عمارت چار سو دس سال قائم رہے گی پھر تباہ ہو جائے گی۔ یہ پیشنگوئی لفظ بزأت کے اعداد سے نکالی گئی تھی۔ پھر کہتا ہے :-

"یہودیوں نے لفظ بماد ماد سے استدلال کرنے کو اس لیے غلط ٹھیرایا ہے کہ اسا

لفظ میں ب نفس کلمہ کا جز نہیں ہے بلکہ ایک حرف ہے جو صلہ کے طور پر لایا گیا ہے۔ اگر اس کو الگ کر دیا جائے تو محمدؐ نام نکالنے کے لیے ایک اور ب کی ضرورت ہوگی اور بمادماد کہنا پڑے گا۔ میں کہتا ہوں کہ تمہاری زبان میں یہ قاعدہ مشہور ہے کہ جب دو ب ایک جگہ جمع ہو جائیں، ایک حرف ہو اور دوسری نفس کلمہ کا جز، ہو تو حرف کو اڑا کر نفس کلمہ کے جز کو باقی رکھا جاتا ہے۔ اس کی مثالیں اتنی کثیر ہیں کہ ان کو بیان کرنے کی بھی حاجت نہیں"۔

یہ تحقیق اتنی معتبر ہے کہ علماء نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء گرامی میں ایک نام ماد ماد بھی لکھا ہے، جیسا کہ قاضی عیاض کی شفا میں مذکور ہے

پانچویں بشارت

کتاب پیدائش باب ۴۹ آیت ۱۰ میں ہے:۔

"یہوداہ سے ریاست کا عصا جدا نہ ہوگا اور نہ حاکم اس کے پاؤں کے درمیان سے جاتا رہے گا جب تک کہ سیلاہ آوے اور قومیں اس کے پاس اکٹھی ہوں گی"۔

انگریزی ترجمہ میں سیلا کو اس کے صحیح تلفظ کے ساتھ شیلوہ (Shileh) لکھا ہے۔ اس کا ترجمہ بعض عربی تراجم میں الذی لہ الکل کیا گیا ہے (یعنی وہ جس کے لیے سب کچھ ہے)۔ اور بعض ترجموں میں الذی ھو لہ سے اس کو تعبیر کیا گیا ہے (یعنی وہ کہ یہ ریاست کا عصا اسی کے لیئے ہے) اس آیت میں موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی شریعتوں کے دور ختم ہونے کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دور، دورہ شروع ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ عبد السلام نے الرسالۃ الھادیہ میں آیت کے ابتدائی فقرے کا صحیح ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

لا یزول الحاکم من یہودا ولا راسم من بین رجلیہ ۔

پھر وہ لکھتا ہے کہ حاکم سے مراد موسیٰ علیہ السلام ہیں، کیونکہ حضرت یعقوب کے بعد وہی ایک صاحب شریعت نبی آئے ہیں۔ اور راسم سے مراد حضرت عیسیٰ ہیں کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد وہی صاحب شریعت نبی آئے ہیں۔ ان دونوں کے بعد کوئی ایسا شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا نہیں آیا جس کی شریعت تمام دنیا پر چھا گئی ہو اور جس نے اسلام نہ لانے والوں کے خیالات، عوائد اور قوانین پر بھی گہرا اثر ڈالا ہو۔ پس معلوم ہوا کہ اس پیشنگوئی میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے "شیلوہ" سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ حاکم اور راسم کے بعد آپ ہی تشریف لائے۔ آپ ہی کو دنیا کی ریاست عطا ہوئی، اور آپ ہی کی طرف قومیں اکٹھی ہوئیں۔ دوسرے انبیائے بنی اسرائیل کو اس کا مصداق نہیں ٹھیرایا جا سکتا، کیونکہ وہ صاحب شریعت نہ تھے، اور یہاں حضرت یعقوب کی مراد صاحب احکام و شریعت ہی سے ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہاں اور ایک نکتہ بھی ہے۔ حضرت یعقوب نے حضرت موسیٰ کے لیے حاکم کا ہم معنی لفظ استعمال فرمایا کیونکہ ان کی شریعت جبری و انتقامی ہے۔ اور حضرت عیسیٰ کو راسم کہا کیونکہ ان کی شریعت نہ جبری ہے نہ انتقامی۔ اس کے بعد "شیلوہ" کا ذکر کیا جس کا مفہوم ان دونوں کا جامع ہے، یعنی اس کو دنیوی سلطنت بھی حاصل ہوگی جس کے لیے جبر و انتقام ضروری ہے اور پھر اس میں عفو و رحمت کی شان بھی ہوگی۔ ان دونوں کا جامع محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون ہے؟ یہ بات نہ مسیح یہود پر صادق آتی ہے جیسا کہ یہودیوں کا گمان ہے، اور نہ عیسیٰ علیہ السلام پر جیسا کہ مسیحی کہتے ہیں۔ یہودیوں کی دنیوی سلطنت کو زائل ہوئے ڈھائی ہزار برس سے زیادہ ہو گئے۔ اور آج تک ان کے مسیح مزعوم کا پتہ نہیں۔ رہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو ان کے ظہور سے ۶ سو برس پہلے ہی یہودیوں کی دنیوی سلطنت ختم ہو چکی تھی۔ وہ اس وقت پیدا ہوئے جب ان کی قوم رومیوں کی بدترین غلامی میں مبتلا تھی۔ خود انہوں نے "یہودا" کی دنیوی سلطنت واپس لینے کی کوشش نہیں کی

بلکہ جس غلامی کی حالت میں پیدا ہوئے تھے اسی میں دنیا سے اٹھ گئے۔ ان کے بعد بھی یہود کو ریاست کا عصا نہ ملا، بلکہ وہ آج تک اس سے مسلوب ہے۔ اس میں شک نہیں ان کے جانے کے سالہا سال بعد ان کا نام لینے والوں کو دنیوی سلطنت ملی مگر ان کی شریعت کے اتباع سے نہیں بلکہ اس کی خلاف ورزی سے۔ خود حضرت عیسیٰ نے کوئی ایسی تعلیم نہیں دی جو دنیوی سلطنت کے حصول میں کسی حیثیت سے بھی مددگار ہو۔ پھر "شیلوہ" کے مصداق وہ کیسے ہو سکتے ہیں۔

چھٹی بشارت

زبور ۴۵ کی پوری عبارت ایک پیشنگوئی ہے اور وہ یہاں لفظ بلفظ نقل کی جاتی ہے:-

۱۔ میرے دل میں اچھا مضمون جوش مارتا ہے میں ان چیزوں کو جو میں نے بادشاہ کے حق میں بنائی ہیں بیان کرتا ہوں۔ میری زبان ماہر لکھنے والے کا قلم ہے۔

۲۔ تو حسن میں بنی آدم[1] سے کہیں زیادہ ہے، تیرے ہونٹوں میں لطف بٹا یا گیا[2] ہے، اسی لیئے خدا نے ابد تک تجھ کو مبارک کیا۔

۳۔ اے پہلوان[3] اپنی تلوار کو جو تیری حشمت اور بزرگواری ہے حمائل کر کے اپنی ران پر لٹکا۔

۴۔ اور اپنی بزرگواری سے سوار ہو اور سچائی اور ملائمت اور صداقت کے واسطے اقبالمندی سے آگے بڑھ اور تیرا داہنا ہاتھ تجھ کو ہیبت کام سکھلا ویگا۔

---

[1] عربی میں بنی البشر اور انگریزی میں (Children of men) لکھا ہے۔ پس بنی آدم سے مراد یہ ہے کہ تو عام انسانوں سے حسن میں زیادہ ہے، یا تیرا حسن غیر معمولی ہے۔

[2] یہ ترجمہ مہمل ہے۔ انگریزی میں صحیح مفہوم ادا کیا گیا ہے (Grace is poured into Thy lips) یعنی تیرے لبوں میں مہر و کرم بھر دیا گیا ہے۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ

[3] پہلوان کا لفظ مترجم کا طبعزاد معلوم ہوتا ہے۔ انگریزی ترجمہ میں (Most [illegible]) لکھا ہے۔ عربی کے قدیم ترجمہ میں القوی اور جدید ترجمہ میں الجبار ہے۔

۵۔ تیرے تیر تیز ہیں۔ لوگ تیرے نیچے گرے پڑتے ہیں وے بادشاہ کے دشمنوں کے دل میں لگ جاتے ہیں۔

۶۔ تیرا تخت اے خدا ابد الآباد تک ہے تیری سلطنت کا عصا راستی کا عصا ہے۔

۷۔ تو صداقت کا دوست اور شرارت کا دشمن ہے اس سبب سے خدا تیرے خدا نے تیرے ساتھیوں سے بڑھ کر تیرے سر پر خوشی کے تیل سے مسح کیا۔

۸۔ تیرے سارے لباس سے مُر اور عود اور تج کی خوشبو آتی ہے کہ جن سے ہاتھی دانت کے محلوں کے درمیان انہوں نے تجھ کو خوش کیا ہے۔

۹۔ بادشاہوں کی بیٹیاں تیری عزت والیوں میں ہیں، تیرے داہنے ہاتھ پر اوفیر کے سونے سے آراستہ ملکہ کھڑی ہے۔

۱۰۔ اے بیٹی سن لے اور سوچ اور اپنے کان ادھر کر اور اپنے لوگوں اور اپنے باپ کے گھر کو بھول جا۔

۱۱۔ تاکہ بادشاہ تیرے جمال کا نہایت مشتاق ہو کہ وہ تیرا خداوند ہے تو اسے سجدہ کر۔

۱۲۔ اور صور کی بیٹی ہدیے لاوے گی قوم کے دولت مند تیری خوشامد کریں گے۔

۱۳۔ شاہزادی گھر کے اندر کُل جلوہ گر ہے[1]۔ اس کا لباس سراسر تاش کا ہے۔

۱۴۔ وہ سوزنی کپڑے پہنے بادشاہ پاس لائی جاتی ہے کنواری عورتیں جو اس کی سہیلیاں ہیں اس کے پیچھے پیچھے تیرے پاس پہنچائی جاتی ہیں۔

۱۵۔ خوشی اور شادمانی سے وے پہنچائی جاتی ہیں۔ وے بادشاہ کے محل میں داخل ہوتی ہیں۔

---

[1] صحیح مفہوم پوری شان سے جلوہ گر ہے۔ یا گھر اس کے جلووں سے معمور ہے۔ انگریزی میں یہ مفہوم All glorious سے ادا کیا گیا ہے۔

"۱۶۔ تیرے بیٹے تیرے باپ داداؤں کے قائم مقام ہوں گے تو انہیں تمام زمین کے سردار مقرر کرے گا۔

۱۷۔ میں ساری پشتوں کو تیرا نام یاد دلاؤں گا۔ پس سارے لوگ ابد الآباد تیری ستائش کریں گے۔"

تمام اہل کتاب تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس زبور میں کسی نبی کی خبر دی ہے جو ان کے بعد آنے والا تھا۔ یہودیوں کے نزدیک ایسا نبی اب تک نہیں آیا جس میں یہ صفات پائی جاتی ہوں۔ پروٹسٹنٹ علماء کہتے ہیں کہ یہ نبی عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اور اہل اسلام بالاتفاق اس کا مصداق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیتے ہیں۔ جو صفات اس زبور میں بیان کی گئی ہیں ان میں سے ایک ایک کو لیجئے اور دیکھیے کہ درحقیقت کون ان سب سے متصف ہے۔

(۱) حسن صورت اور ایسا حسن صورت جو عام انسانوں سے بالاتر ہو مسیح علیہ السلام کے متعلق اس قسم کی کوئی روایت نہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے ما رأیت شیئاً احسن من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان الشمس تجری فی وجہہ واذا ضحك يتلألأ في الجدر۔ میں نے کوئی چیز آنحضرت صلعم سے زیادہ خوبصورت نہیں دیکھی آپ کی صورت ایسی تھی گویا آفتاب ہے اور جب آپ ہنستے تو موتیوں کی لڑی سی چمکتی نظر آتی۔ ام معبد رضی اللہ عنہا آپ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتی ہیں اجمل الناس من بعید واحلاہم واحسنہم من قریب۔ دور سے دیکھو تو آپ سب لوگوں سے زیادہ جمیل اور قریب سے دیکھو تو سب سے زیادہ حسین و شیریں۔ براء ابن عازب کہتے ہیں ما رأیت شیئاً قط احسن منہ میں نے حضور سے زیادہ خوبصورت کوئی چیز کبھی نہیں دیکھی۔ حضرت علی فرماتے ہیں لم ار قبلہ ولا بعدہ مثلہ میں نے نہ حضور سے پہلے کوئی آدمی آپ جیسا دیکھا اور نہ آپ کے بعد۔ دوسرے موقع پر حضرت علی فرماتے

ہیں۔ اجود الناس صدرًا واصدق الناس لہجۃ والینھم عریکۃ واکرمھم عشیرۃ من راٰہ بدیھۃ ھابہ ومن خالطہ معرفۃ احبہ۔ آپ سب سے زیادہ دریادل، سب سے بڑھ کر خوش بیان، سب سے زیادہ نرم خو، سب سے بڑھ کر ملنسار تھے۔ جو آپ کو پہلی مرتبہ دیکھتا وہ آپ کی شخصیت سے مرعوب ہو جاتا اور جو آپ سے واقف ہونے کے بعد ملتا وہ آپ کا گرویدہ ہو جاتا۔ ھند بن ابی ہالہ کا بیان ہے یتلالأ وجہہ تلألؤ القمر لیلۃ البدر حضور کا چہرہ ایسا چمکتا تھا جیسے چودھویں رات کا چاند۔ جابر بن سمرہ کہتے ہیں کہ "ایک رات آنحضرت صلعم ایک سرخ حلہ پہنے ہوئے تشریف رکھتے تھے اور چاند نکلا ہوا تھا۔ میں ایک نظر چاند پر ڈالتا اور ایک نظر حضور پر۔ مجھے چاند سے زیادہ حضور حسین معلوم ہو رہے تھے۔" جن لوگوں نے آپ کو دیکھا ہے وہ آپ کا حلیہ پوری تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ تناسب اعضاء اور حسن وجمال کے اعتبار سے احسن تقویم کا کمل نمونہ تھے۔

(۲) شیرینی بیان۔ اس باب میں بھی مسیح علیہ السلام کے متعلق کچھ منقول نہیں۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دوست ودشمن سب اقرار کرتے ہیں کہ آپ غایت درجہ کے فصیح اللسان اور شیریں کلام تھے حتیٰ کہ آپ کی تقریر سخت سے سخت مخالف تک کے دل میں اتر جاتی تھی۔

(۳) خدا نے ابد تک مبارک کیا۔ اس سے بڑھ کر برکت کیا ہو گی کہ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ۔ اور یہی نہیں بلکہ۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ساڑھے تیرہ سو برس سے بے شمار مخلوق حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر روزانہ کئی کئی بار درود بھیجتی رہی ہے اور قیامت تک بھیجتی رہے گی۔

(۴) مادی طاقت، تلوار اور قوت قاہرہ۔ یہ چیز حضرت عیسیٰ کو ملی ہی نہیں۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی ملی کہ جس طاقت نے آپ کا مقابلہ کیا اس کو آخر کار نیچا دیکھنا پڑا۔ یہی نہیں بلکہ آپ کو

جسمانی قوت بھی ایسی دی گئی تھی کہ آپ نے عرب کے مشہور پہلوان رکانہ کو اسطرح پچھاڑ دیا گویا وہ آپ کے ہاتھ میں ایک بچہ تھا۔ آپ کی شجاعت کا یہ عالم تھا کہ حضرت علی جیسا بہادر سپاہی کہتا ہے، کہ جنگ میں جب ہم پر سخت وقت آتا تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پناہ لیتے۔ تمام عمر کبھی لڑائی میں پیٹھ نہیں دکھائی بلکہ اپنے مقام سے ہٹتے تک نہیں۔ جنگ حنین میں تمام فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بظاہر شکست ہو چکی تھی۔ مگر ایک اللہ کا رسول تھا کہ میدان جنگ میں پہاڑ کی طرح قائم تھا اور کہہ رہا تھا :۔

انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب

ابن عمر رضی اللہ عنہ وعن ابیہ کا بیان ہے کہ ما رأیت اشجع من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ میں نے حضور سے زیادہ بہادر کوئی شخص نہیں دیکھا۔

(۵) امانت، حلم اور صداقت۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ خصوصیات ہیں جن کا دشمنوں نے بھی اعتراف کیا ہے۔ کفار قریش سے بڑھ کر آپ کا دشمن کون ہوگا۔ ان کو بھی آپ کی امانت پر بھروسہ تھا۔ ابو سفیان نے اس زمانے میں جب وہ دشمنان اسلام کا سپہ سالار تھا قیصر روم کے سامنے آپ کی راست گوئی کا اقرار کیا۔ حلم کا یہ حال تھا کہ مکہ فتح کرتے ہیں۔ وہ دشمن جنھوں نے آپ کو سخت اذیتیں دیکر وطن سے نکالا اور پھر دار الھجرت میں بھی آپ کو آٹھ برس تک چین سے نہ بیٹھنے دیا، آپ کے بس میں ہیں۔ چاہیں تو ایک ایک سے بدلہ لیں۔ مگر سب کو معاف فرما دیتے ہیں، اور معاف ہی نہیں فرماتے بلکہ احسان اور نوازشات سے اتنا سرفراز فرماتے ہیں کہ پرانے دوستوں اور جان نثاروں کی زبانوں تک حرف شکایت آجاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر حلم کی مثال یہ ہے کہ جو عورت آپ کے پیارے چچا کا کلیجہ نکال کر چبا گئی تھی اس کو بھی معاف کر دیا اور عنایات سے نوازا۔ تاریخ عالم ایسے حلم و عفو اور فراخ دلی کی نظیر پیش کرنے سے

عاجز ہے۔

(۶) تیرے تیر تیز ہیں، دشمنوں کے دل میں لگ جاتے ہیں۔ لوگ تیرے نیچے گرے پڑتے ہیں۔ یہ مجازی کلام ہے۔ دل میں لگنے والا تیر در اصل لوہے کا نہیں زبان کا تیر ہوتا ہے۔ یہ تیر قرآن کے تیر تھے کہ بڑے بڑے پتھر کے کلیجے اس کو سن کر پانی ہو گئے۔ مخالفین اسلام اس کو سنتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں دل میں نہ اتر جائے۔ ایک نہیں بیسیوں کفار ایسے تھے کہ دشمنی کے ارادے سے آئے اور قرآن کے تیر سے مجروح ہو کر رہ گئے۔ اسی کا اثر تھا کہ لوگ فوج در فوج حضور کے قدموں کے نیچے اکٹھے ہوتے چلے جاتے تھے۔ یدخلون فی دین اللہ افواجًا۔

(۷) تو صداقت کا دوست اور شرارت کا دشمن ہے۔ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسی راست آتی ہے کہ کسی پر نہیں آتی۔ اسی لیے آپ کو اللہ نے ایسی کامیابی عطا کی کہ انبیاء میں سے کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔

(۸) بادشاہوں کی بیٹیاں تیری عزت والیوں میں ہیں۔ بادشاہوں سے مراد سردارانِ قبائل ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثر ازواج مطہرات عرب کے معزز سرداروں کی بیٹیاں تھیں۔

(۹) اوفیر کے سونے سے آراستہ ملکہ حضرت داؤد اس کو اے بیٹی سے خطاب کرتے ہیں اور اس کو نصیحت کرتے ہیں کہ تو اپنے شوہر کی مطیع بن اور اپنے لوگوں کو بھول جا۔ یہ اشارہ ہے حضرت صفیہ ام المومنین کی طرف۔ وہ اسرائیلی سردار حیی بن اخطب کی بیٹی تھیں۔ حرم نبوی میں داخل ہونے کے بعد ذات رسالت پناہ میں ایسی محو ہوئیں کہ پھر ان کو اپنے خاندان اور اپنے عزیزوں کا خیال تک نہ آیا۔

(۱۰) قوم کے دولت مند تیری خوشامد کریں گے۔ حضرت عثمانؓ، حضرت ابو بکرؓ اور دوسرے دولت مند صحابہ نے اپنی ساری دولتیں حضور کے قدموں میں ڈال دیں۔ باہر کے ملوک اور امراء میں سے نجاشی شاہ حبش، مقوقس مصر، ہرقل قیصر روم، اور ملوک بحرین و عمان نے آپ کے پاس

تحائف اور ہدیے بھیجے۔

(۱۱) تیرے بیٹے تیرے باپ دادوں کے قائم مقام ہوں گے۔ یہ ائمۂ اہل بیت علیہم السلام پر صادق آتی ہے۔ تمام دنیا کے مسلمان (باستثناء خوارج) ان کی سرداری کو تسلیم کرتے ہیں دنیوی برجو اقتدار ان کو حاصل ہوا اور اب تک حاصل ہے وہ بادشاہوں کو کبھی نصیب نہیں ہوا۔

(۱۲) سارے لوگ ابد الآباد تک تیری ستائش کریں گے۔ مسلم اور غیر مسلم جس کثرت کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح وثنا کرتے ہیں، نوع انسانی میں سے کسی شخص کی نہیں کرتے۔ آج کروڑوں انسان اذانوں میں آپ کا نام بلند کرتے ہیں، نمازوں میں آپ پر صلوٰۃ و سلام بھیجتے ہیں تحریروں اور تقریروں میں آپکی ثنا وصفت بیان کرتے ہیں آپکے نشان کف پا تک کو سروں پر رکھا جاتا ہے اور جس چیز کو آپ کی ذات سے ادنیٰ سی نسبت بھی حاصل ہے وہ آنکھوں سے لگائی جاتی ہے۔

اب دیکھو کہ دنیا میں کون ایسا شخص گذرا ہے یا آج پایا جاتا ہے جس پر حضرت داؤد علیہ السلام کی بیان کردہ علامتیں اس قدر ٹھیک صادق آتی ہوں۔ مسیح علیہ السلام نہ حسین و جمیل تھے۔ نہ طاقت ور تھے، نہ تلوار ان کو نصیب ہوئی، نہ ان کے تیروں میں کوئی تیزی تھی، نہ لوگ فوج در فوج ان کے قدموں کے نیچے آئے، نہ امراء نے ان کی اطاعت کی، نہ بادشاہوں نے ان کو ہدیے بھیجے، نہ ان کے حرم میں کوئی عورت داخل ہوئی۔ نہ وہ صاحب اولاد ہوئے کہ ان کے بیٹے اپنے بزرگوں کے قائم مقام ہوتے۔

ساتویں بشارت

زبور ۱۴۹ میں ہے:۔

" ۱۔ خداوند کی ستائش کرو خداوند کے لیے ایک نیا گیت گاؤ اور اس کی مدح

۲۔ اسرائیل اپنے بنانے والے سے شادمان ہووے بنی صیہون اپنے بادشاہ کے سبب خوشی کریں۔

۳۔ وے اس کے نام کی ستائش کرتے ہوئے رقص کریں وے طبل اور بربط بجاتے ہوئے اس کی ثناخوانی کریں۔

۴۔ کیونکہ خداوند اپنے لوگوں سے خوش ہوتا ہے وہ حلیموں کو نجات کی زینت بخشتا ہے

۵۔ پاک لوگ اپنی بزرگواری پر فخر کریں اور اپنے بستروں پر بلند آواز سے گائیں۔

۶۔ خدا کی ستائش بلند آواز سے ان کی زبانوں پر ہووے اور ایک دو دھاری تلوار ان کے ہاتھ میں ہو۔

۷۔ تاکہ غیر امتوں (کفار = Heathen) سے انتقام لیویں اور لوگوں کو سزا دیویں

۸۔ تاکہ ان کے بادشاہوں کو زنجیروں سے اور ان کے امیروں کو لوہے کی بیڑیوں سے جکڑیں۔

۹۔ تاکہ ان پر وہ فتویٰ جو لکھا ہوا ہے جاری کریں کہ اس کے پاک لوگوں کی یہی شوکت ہے۔ خداوند کی ستائش کرو۔"

اس زبور میں جس بادشاہ اور جس گروہ کی بشارت دی گئی ہے، اس کی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ اللہ کے لوگ (حزب اللہ) ہیں، پاک لوگ (ابرار) ہیں، حلیم اور نرم خو (اذلّۃ علی المومنین اور رحماء بینھم) ہیں، خدا کی ستائش بلند آواز سے کرنے والے ہیں (اذان اور صدائے تکبیر) دو دھاری تلوار ان کے ہاتھ میں ہے، کفار سے انتقام لیتے اور فجار کو سزا دیتے ہیں، ملوک اور امراء کو گرفتار کریں گے اور ان پر خدا کا مقرر کیا ہوا فیصلہ جاری کریں گے۔

یہ تمام صفات محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ پر صادق آتی ہیں سلیمان علیہ السلام

اس پیشنگوئی کے مصداق نہیں ہوسکتے کیونکہ اہل کتاب کا اپنا قول یہ ہے کہ ان کی مملکت حضرت داؤد علیہ السلام کی مملکت سے زیادہ وسیع نہیں ہوئی، نیز یہ بھی انھیں کا قول ہے کہ وہ مرتد ہو گئے تھے اور آخر عمر میں انہوں نے بت پرستی شروع کردی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اس کے مصداق نہیں ہوسکتے کیونکہ وہ اور ان کے حواری ان اوصاف سے بمراحل دور ہیں بلکہ ان کا عکس اُن پر صادق آتا ہے۔ ملوک وامراء کو گرفتار کرنا اور ان کو سزا دینا تو درکنار وہ تو خود گرفتار ہوئے اور سخت ذلت کے ساتھ ان کو سزا دی گئی۔

آٹھویں بشارت

یسعیاہ نبی کی کتاب باب ۴۲ میں ہے:-

"دیکھو تو سابق پیشنگوئیاں بر آئیں اور میں نئی باتیں تبلاتا ہوں اس سے پیشتر کہ واقع ہوں میں تم سے بیان کرتا ہوں۔ خداوند کے لیے ایک نیا گیت گاؤ اور اس کی حمد کرو زمین کے انتہائی سرے سے، اے تم جو سمندر پر گذرتے ہو اور وہ جو اس میں بستے ہو، جزائر اور ان کے باشندو۔ بیابان اور اسکی بستیاں قیدار کے آباد گاؤں اپنی آواز بلند کریں گے، سلع کے بسنے والے گائیں گے پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے للکاریں گے۔ وے خداوند کا جلال ظاہر کریں گے اور بحری ممالک میں اس کی ثنا خوانی کریں گے خداوند ایک بہادر کے مانند نکلے گا وہ ایک جنگی مرد کے مانند اپنی غیرت کو اکسائے گا وہ چلائے گا ہاں، وہ جنگ کے لیے بلائیگا وہ اپنے دشمنوں پر بہادری کرے گا میں

ف۔ انگریزی ترجمہ میں لفظ سلع کو ٹکڑا Rock لکھا گیا ہے اور عربی ترجمہ میں اس کا اتباع کرکے صخرہ یعنی چٹان کا لفظ لکھا ہے۔ مگر اردو ترجمہ میں صاف طور پر سلع لکھا ہے۔

بہت مدت سے چپ رہا میں خاموش ہو رہا اور آپ کو روکتا گیا پر اب میں اس عورت کی طرح جسے درد زہ ہو چلاؤں گا میں ہانپوں گا اور یکایک نگل جاؤں گا[1]۔ میں پہاڑوں اور ٹیلوں کو ویران کر ڈالونگا ان کے سبزہ زاروں کو خشک کر دونگا، ندیوں کو جزیرے بنا دونگا اور جھیلوں کو سکھا دونگا۔ اور میں اندھوں کو اس راہ سے کہ جسے وے نہیں جانتے لیجاؤنگا۔ میں انہیں ان رستوں پر جن سے وے آگاہ نہیں لے چلونگا۔ میں ان کے آگے تاریکی کو روشنی اور ناہموار کو ہموار کر دونگا میں ان سے یہ سلوک کرونگا اور انہیں ترک نہ کرونگا۔ وہ پیچھے ہٹینگے اور نہایت پشیمان ہوں گے[2] جو تراشی ہوی مورتوں کا بھروسہ رکھتے ہیں اور ڈھالے ہوے بتوں کو کہتے ہیں تم ہمارے الٰہ ہو" (۹-۱۷)۔

یسعیاہ علیہ السلام نے اس پیشنگوئی میں جس کے متعلق خود انہوں نے تصریح کر دی ہے کہ اس کا ظہور آئندہ زمانہ میں ہوگا، چند باتیں بیان کی ہیں۔

۱۔ خدا کی عبادت اور اس کی حمد اور تسبیح ایک نئے طرز پر ہوگی یہ اشارہ ہے نماز کی طرف۔

۲۔ وہ تمام سکان ارض پر عام ہوگی۔ بحر و بر اور دشت و جبل کے باشندوں میں پھیل جائے گی، اور زمین کے انتہائی سروں تک پہنچے گی۔ یہ اشارہ ہے عموم دعوت اسلام کی طرف۔

۳۔ قیدار کے آباد گاؤں اپنی آواز بلند کریں گے۔ یہ صریح اشارہ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف، کیونکہ آپ آل قیدار میں سے ہیں۔ قیدار کی نسل سے آپ کے سوا کوئی نبی نہیں اٹھا، اور آپ ہی کے ذریعہ سے قیدار کی بستیوں کا آوازہ چار دانگ عالم میں بلند ہوا۔

---

[1] اردو ترجمہ میں "ہانپونگا اور زور زور سے ٹھنڈی سانس بھی لونگا" لکھا ہے۔ مگر عربی اور انگریزی ترجمے اس کے خلاف ہیں۔ عربی ترجمہ میں ابدد وابتلع معاً ہے اور انگریزی ترجمہ یہ ہے۔ I will destroy and devour at once

[2] اردو ترجمہ میں "وے پیچھے ہٹیں اور نہایت پشیمان ہوں" لکھا ہے۔ مگر انگریزی ترجمہ یوں ہے:۔

They shall be turned back, they shall be greatly ashamed

۴۔ سلع کے بسنے والے گائیں گے، پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے للکاریں گے۔ یہ صاف نشان وہی ہے۔ اس سرزمین کی جہاں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ بلند ہونے والا تھا۔ سلع مدینہ طیبہ کے قریب ایک مشہور پہاڑی ہے، اب تک اسی نام سے معروف ہے اور اس کے پاس غزوۂ خندق کے آثار اس وقت تک پائے جاتے ہیں۔

(۵) پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے للکاریں گے۔ یہ اشارہ ہے حج کی طرف جس میں ہزار در ہزار انسان لبیک کی آوازیں بلند کرتے ہیں۔

۶۔ "خداوند کا جلال ظاہر کریں گے" اور اس کے بعد جو کچھ ہے اس میں صاف اشارہ ہے کہ یہ لوگ جہاد کریں گے، اور یہ جہاد خدا کے لیے، خدا کی طرف سے اور خدا کی تائید کے ساتھ ہوگا۔

۷۔ "پھولوں گا اور یکایک نگل جاؤں گا" اور اس کے بعد جو کچھ کہا ہے وہ اشارہ ہے اس انقلاب عظیم کی طرف جو ظہور دعوت اسلام کے بعد یکایک رونما ہوگا اور دیکھتے دیکھتے دنیا کا رنگ بدل دے گا۔

۸۔ اندھوں کو چلانے اور ان کے لیے تاریکی کو نور سے تبدیل کرنے کا مضمون بعینہٖ وہی ہے جو قرآن میں آیا ہے۔ ان کانوا من قبل لفی ضلال مبین۔ اور اللہ ولی الذین آمنوا یخرجہم من الظلمٰت الی النور۔ آل قیدار بالکل جاہل گمراہ اور راہ راست سے ناواقف تھے اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ان اندھوں کو راستہ دکھایا اور ضلالت کی تاریکی کو ہدایت کے نور سے بدل دیا۔

۹۔ "میں ان سے یہ سلوک کروں گا اور انھیں ترک نہ کروں گا" یہ اشارہ ہے شریعت محمدی کے دوام اور اس کے عدم نسخ کی طرف۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ۔

۱۰۔ آخری فقرہ میں بتایا گیا ہے کہ جب یہ دعوت ظاہر ہوگی تو بت پرستوں کا زور ٹوٹ

جائیگا اور وہ ذلیل و خوار ہوں گے یہ بھی مسلمانوں کے ذریعہ سے پورا ہوا۔ دنیا کے ایک بڑے حصہ میں تو بت پرستی کا نام ونشان ہی مٹ گیا۔ اور جہاں یہ چیز ابھی باقی ہے وہاں بھی دم توڑ رہی ہے۔ تمام دنیا کے افکار پر توحید کا عقیدہ اس طرح چھا گیا ہے کہ کوئی شخص جو علم و عقل سے تھوڑا سا بھی بہرہ رکھتا ہے، اس سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔

نویں بشارت

یسعیاہ نبی کی کتاب کا باب ۵۴ پورا کا پورا ایک پیشینگوئی پر مشتمل ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"اے بانجھ تو جو نہیں جنتی تھی خوشی سے للکار۔ تو جو حاملہ نہ ہوتی تھی وجد کرکے گا اور خوشی سے چلا کیونکہ خداوند فرماتا ہے کہ بے کس چھوڑی ہوئی کی اولاد شوہر والی کی اولاد سے بھی زیادہ ہے۔ اپنی خیمہ گاہ کو بڑھا دے اں اپنے مسکنوں کے پردے پھیلا دریغ مت کر اپنی ڈوریاں لمبی اور اپنی میخیں مضبوط کر۔ اس لیئے کہ تو دہنے اور بائیں طرف بڑھیگی اور تیری نسل قوموں کی وارث ہوگی اور اجاڑ شہروں کو بساوے گی۔ مت ڈر کہ تو پھر پشیمان نہ ہوگی تو مت گھبرا کہ تو پھر رسوا نہ ہوگی تو اپنی جوانی کا ننگ بھول جائیگی اور اپنی بیوگی کا عار پھر یاد نہ کرے گی۔ کیونکہ تیرا خالق تیرا شوہر ہے اس کا نام رب الافواج ہے۔ اور تیرا نجات دینے والا اسرائیل کا قدوس ہے۔ وہ ساری زمین کا خدا کہلائیگا کیونکہ تیرا خدا کہتا ہے کہ خداوند نے تجھے جو مطلقہ اور دل آزردہ عورت کی طرح ہے اور جوانی کی منکوحہ کے مانند ہے جسے چھوڑ دیا گیا ہو پھر بلایا ہے۔ میں نے ایک دم کے لیے تجھے چھوڑ دیا لیکن اب میں بہت سی مہربانیوں کے ساتھ تجھے سمیٹ لوں گا۔ قہر کی شدت کے حال میں میں نے اپنا منہ تجھ سے ایک لحظہ چھپایا پر اب میں ابدی عنایت سے تجھ پر رحم کرونگا۔

خداوند تیرا بچانے والا یوں فرماتا ہے۔ میرے آگے یہ نوح کے پانی کا سا معاملہ ہے کہ
جس طرح میں نے قسم کھائی تھی کہ پھر زمین پر نوح کا سا طوفان کبھی نہ آئے گا اسی طرح
اب میں نے قسم کھائی ہے کہ میں تجھ سے پھر کبھی آزردہ نہ ہوں گا اور تجھ کو نہ جھڑکوں گا
پہاڑ ٹل جائیں اور ٹیلے ہل جائیں پر میری رحمت تجھ سے کبھی زائل نہ ہوگی اور میری
سلامتی کا عہد جنبش نہ کرے گا۔ خداوند جو تیرا رحم کرنے والا ہے یوں فرماتا ہے۔

"اے تو جو آزردہ خاطر ہے اور آندھی کی اچھالی ہوئی ہے اور تسلی سے محروم ہے۔
دیکھ کہ میں تیرے پتھروں کو اچھے رنگ سے جاؤں گا[1] اور تیری بنیاد نیلموں سے ڈالوں
گا۔ میں تیری فصیلوں کو لعلوں سے اور تیرے پھاٹکوں کو چمکتے ہوئے جواہر سے اور تیرا
سارا احاطہ بیش قیمت پتھروں سے بناؤں گا۔ اور تیرے سب فرزند بھی خداوند
سے تعلیم پاویں گے اور تیرے فرزندوں کی سلامتی کامل ہوگی۔ تو راست بازی
سے پائیدار ہو جاویگی تو ظلم سے دور رہے گی کیونکہ تو نہ ڈرے گی اور گھبراہٹ
کہ وہ تیرے قریب نہ آئے گی۔ خبردار وہ اکٹھا کر ضرور آئیں گے پر میرے حکم سے نہیں۔
جو کوئی تیرے برخلاف جمع ہوں گے وہ اپنوں کو چھوڑ کر تیرے ہو جائیں گے۔ دیکھ میں
نے لوہار کو پیدا کیا جو کوئلے آگ میں ڈال کر پھونکتا اور اپنے کام کے لیے اوزار نکالتا
ہے اور میں نے ہی غارت گر کو پیدا کیا ہے کہ ہلاک کرے۔

"کوئی ہتیار جو تیرے خلاف بنایا گیا کام نہ آوے گا۔ اور جو زبان عدالت میں
تجھ پر چلے گی تو اسے مجرم کرے گی یہ خداوند کے بندوں کی میراث ہے اور ان کی
راست بازی مجھ سے ہے خداوند فرماتا ہے۔"

[1] اردو ترجمہ میں لکھا ہے "دو تیرے پتھروں کو سرمہ میں لگاؤں گا"۔ انگریزی ترجمہ کے الفاظ یہ ہیں
I will lay thy stones with fair colours:-

اس پیشنگوئی میں بانجھ عورت سے مراد سرزمین عرب ہے جس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کوئی کتاب نازل نہ ہوئی تھی اور اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد کوئی نبی نہ آیا تھا۔ "وَمَا آتَيْنٰهُم مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَا اَرْسَلْنَا اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ"۔ "بے کس چھوڑی ہوئی کی اولاد" سے مراد اہل عرب ہیں جن سے بظاہر صدہا سال تک اللہ تعالیٰ نے منہ موڑ رکھا تھا، اور شوہر والی کی اولاد سے بنی اسرائیل مقصود ہیں، جن کے ہاں بکثرت انبیاء مبعوث ہوئے اور پیہم وحی کا نزول ہوتا رہا۔ اس تشریح کے بعد پوری پیشنگوئی کو پڑھیے اور دیکھیے کہ کس طرح وہ حرف بحرف ارض عرب اور اہل عرب کے حق میں پوری ہوئی۔

اس پیشنگوئی کو اس کے اصل مقصود سے پھیرنے والا صرف ایک فقرہ ہے اور وہ "اسرائیل کا قدوس" ہے۔ مگر اہل کتاب جس طرح اپنی کتابوں میں تحریف کرتے رہے ہیں اس کی نہایت بین مثالیں اس مضمون کی ابتداء ہی میں پیش کی جا چکی ہیں۔ لہٰذا کچھ عجب نہیں کہ بعد میں یہ فقرہ قصداً بڑھایا گیا ہو۔ (باقی)

بچوں کے لئے مفید کتابیں

ہمارے نبی کے صحابہ اس کتاب میں صحابہ کرام کی زندگی کے سبق آموز واقعات نہایت سلیس زبان اور دلنشین انداز بیان کے ساتھ درج کئے گئے ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ بزرگوں کے اخلاق دینداری حسن معاشرت اور نیک معاملات کا حال معلوم ہوتا ہے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کا شوق پیدا ہوتا ہے قیمت ۳؍ حالی ۶؍ کلدار علاوہ محصول ڈاک

مسلمان بی بیاں یہ کتاب "ہمارے نبی کے صحابہ" کی طرح صحابیہ خواتین کے حالات پر مشتمل ہے، جس میں ان مقدس ہستیوں کی دینداری حسن اخلاق اور خانگی زندگی میں ان کے نیک برتاؤ کے واقعات بیان کیے گئے ہیں مسلمان بچیوں کے لئے یہ کتاب شمع ہدایت ہے اور بہت سادہ زبان میں لکھی گئی ہے قیمت ۳؍ حالی ۶؍ کلدار علاوہ محصول ڈاک

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجئے۔

قرآنی نظریہ سلطنت

اُس کے مقدمات اور اسکی روح

(۲)

از پروفیسر ہارون خان شروانی ایم اے (آکسن) بار ایٹ لا استاذ کلیہ جامعہ عثمانیہ
ترجمہ جناب مولوی سعید الحق صاحب عمادی بی ایس سی (علیگ)

اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں قرآنی نظم سلطنت (Polity) کی روح سے بحث کی جا سکتی ہے، اور جہاں بالفعل تقابل اور موازنہ کئے بغیر ہم سیاسیات عالم کے اُس ارتقاء کو ٹھیک سمجھ سکتے ہیں جس کا ظہور قرآن مجید میں ہوا ہے۔ ابتدا میں اس امر کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اس محدود بحث میں ہم حدیث کے اس وسیع ذخیرہ سے استفادہ نہ کر سکیں گے۔ جو ہمارے پاس پیغمبر اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے متعلق معلومات کا ایک اہم ماخذ ہے، اگرچہ یہ بات معلوم و معروف ہے کہ آج تک کسی انسان کی زندگی کو اس کے ہمعصروں اور اس کے اخلاف نے اس قدر تفصیل اور ایسی صحت کے ساتھ محفوظ نہیں رکھا ہے جس کے ساتھ اس ہستی کی زندگی محفوظ رکھی گئی ہے جس نے دنیا کے سامنے قرآن کو پیش کیا قرآن مجید ہدایات اور احکام پر مشتمل ہے جو بعض مقامات پر نہایت مفصل اور بعض مواقع پر بہت مجمل ہیں، اور جگہ جگہ ان میں تاریخی واقعات کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں۔ یہاں ہم زیادہ تر اس کتاب کے سیاسی پہلو سے بحث کریں گے اور اس کے ساتھ جہاں کہیں کوئی تاریخی

اشارہ ہوگا وہاں دوسرے مشہور و مستند مآخذ سے اصل عبارت کی تشریح کر دیں گے۔

رسول اللہ کے سیاسی کارنامے اس کام کے آغاز سے پہلے یہ مناسب ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی کا ایک نہایت مختصر خاکہ ابتدائے نزول وحی سے لے کر آپ کے وصال تک بیان کر دیا جائے، جو ۲۳ قمری سنین پر مشتمل ہے۔ آپ کی عمر چالیس سال کی تھی جب آپ پر مکہ سے دو میل دور ایک سنسان غار میں وہ قابل غور آیت نازل ہوئی جس میں ایک امی محض انسان سے کہا گیا تھا کہ تو "پڑھ" اور جس میں ایک طرف انسان کی حقیر اصل اور دوسری طرف انسانی بزرگی و برتری کے سرچشمے، یعنی علم کی اہمیت بڑی خوبی کے ساتھ ظاہر کی گئی تھی۔[۱] قرآن کا اصل مقصد یہی تھا کہ اصول فطرت کی تبیین کے ساتھ حقائق کا علم بخشے۔ اس کی تمام ہدایات کا مبنیٰ یہ ہے کہ ان کے ذریعہ سے انسان پر کائنات کے ابدی قانون کے اسرار منکشف ہوں، اور غالباً اسی مطمح نظر کے لحاظ سے اس طریق زندگی کو جس کی طرف قرآن نے رہنمائی کی ہے، "قدیم" بھی کہا گیا ہے اور "غیر متبدل" بھی۔[۲]

اسلامی سلطنت کے اساسی اصول بیعت عقبۂ اولیٰ و ثانیہ کے ان میثاقوں میں امتیازی نشانات کے ساتھ نظر آتے ہیں جو ۶۲۱ء اور ۶۲۲ء میں لیے گئے تھے۔ انسان یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتا ہے کہ ان نہایت اہم بیعتوں میں سے پہلی بیعت چند مٹھی بھر اشخاص (صرف ۱۲ آدمیوں) سے لی گئی تھی جو مکہ کے باہر پیغمبر اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی خدمت

---

[۱] اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (قرآن سورۂ علق)۔

[۲] فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا، فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔ (الروم: رکوع ۴)۔

میں حاضر ہوئے تھے، ایک بے یار و مددگار انسان ایک خار دار درخت کے نیچے بیٹھا ہوا ان چند آدمیوں سے اس امر پر بیعت لے رہا تھا کہ وہ کائنات کے غیر متبدل قانون کی پیروی کریں گے، خدا کے سوا کسی کی پیروی نہ کریں گے، چوری اور زنا اور قتل اولاد اور افتراء سے مجتنب رہیں گے اور ہر حال میں وفاداری پر قائم رہیں گے، خواہ خوشحالی ہو یا تنگ حالی[1]

اس میثاق میں اس تزکیۂ نفس، اصلاح تمدن اور محکم قانونی تدبیر کے ابتدائی جراثیم چھپے ہوئے ہیں، جو بعد میں پوری قوت کے ساتھ روبعمل آنے والی تھی۔ اس کے دو سال بعد دوسری بیعت کے موقع پر اس امر کا قطعی عہد لیا گیا کہ وہ ہر چیز میں رسول خدا کی اطاعت کریں گے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانب سے اس امر کی تصریح فرمائی کہ آپ کا مفاد اور ان کا مفاد ایک ہے[2] اسی سال اہل مکہ کی ایذا رسانی اور ظلم و ستم سے تنگ آکر مسلمانوں کی مختصر سی جماعت اپنے ہادی و پیشوا کی معیت میں امن و سلامتی کی اس جنت کی طرف ہجرت کر گئی جس کا نام یثرب تھا اور بعد میں مدینۃ النبی یا اختصار کے ساتھ صرف مدینہ کے نام سے موسوم ہوا۔ وہاں مواخاۃ کے انتہائی حکیمانہ طریقہ کو اختیار کر کے اس جلیل القدر اسلامی برادری کی بنیاد رکھی گئی جو نسلی، لسانی اور جغرافی امتیازات سے قطعاً بیگانہ تھی۔ اس میں مکہ سے آئے ہوئے مہاجر اور ان کے مدنی مددگار (انصار) بالکل ایک دوسرے کے بھائی بھائی بنا دیے گئے[3]

---

[1] ابن ہشام جلد اول حصہ اول۔ (تہذیب و تحشیۂ وستنفیلد) ص ۲۸۸۔

[2] " " " " ص ۲۹۷۔

[3] " " " ص ۳۴۴۔

مدینہ میں مسلمانوں کو مقامی یہودیوں سے معاملہ کرنا تھا۔ اس نوزائیدہ ریاست کو نہ صرف ان کا لحاظ کرنا پڑا بلکہ مدینہ کے مسلم باشندوں کو بھی اپنی حفاظت و حمایت میں لینا پڑا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبردست پیش بینی اور سیاسی تدبیر اس عہدنامہ میں نظر آتی ہے جو آپ نے یہودیوں کو عطا کیا۔ اس میں منجملہ دوسرے امور کے یہ تصریح کی گئی تھی کہ یہودی بھی اس نئی ریاست کے ویسے ہی "وطنی" (Citizen) ہوں گے جیسے مسلمان ہیں، اہل یثرب کی یہ دونوں شاخیں مل کر ایک مرکب قوم بنائیں گی۔ مجرم کو سزا دی جائے گی خواہ وہ کسی مذہب کا ہو، ضرورت کے وقت دونوں پر ریاست کی مدافعت کا فرض عائد ہوگا، اور آئندہ جو نزاعات پیش آئیں گی، ان کا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کریں گے[1]۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اگر وہ لوگ جن کو نبی صلعم نے اس طرح اپنی حمایت میں لیا تھا، اپنے قول پر قائم رہتے تو آزادی ضمیر اور مشترک وطنیت کا یہ پروانہ اپنی جگہ بدستور قائم رہتا۔ مگر زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ یہودیوں نے گردن کشی شروع کر دی اور نوخیز ریاست کے مقابلہ میں عین اس وقت اٹھ کھڑے ہوئے جب کہ اس کا وجود ملکی غارت گروں کے حملے سے خطرے میں مبتلا تھا۔

پیغمبر اسلام (علیہ السلام) نے بے خوف و خطر ایک دوسرا پروانہ آزادی نجران کے عیسائیوں کو عطا کیا جس میں ان کو جان، مال اور دین کی امان دی گئی تھی اور ان کو اطمینان دلایا گیا تھا کہ انھیں اپنے مذہبی اعمال میں پوری آزادی حاصل ہوگی، کوئی قسیس راہب اور پادری اپنے عہدہ سے نہ ہٹایا جائے گا، کوئی تمثال یا صلیب نہ توڑی جائے گی

---

[1] ابن ہشام جلد اول صلہ ۳۴۱۔

کوئی عشر اُن پر عائد نہ کیا جائے گا۔ اور نہ کبھی ان سے فوج طلب کی جائے گی۔[1]

تاریخ گواہ ہے کہ یہ عہدنامے محض اس وجہ سے باطل ہوئے کہ یہودیوں نے اور ان کی پیروی میں عیسائیوں نے خود ان کی خلاف ورزی کی۔ اسی طرح نبی صلعم کو غسان کے عیسائیوں کے خلاف ایک فوج صرف اس وجہ سے بھیجنی پڑی کہ انہوں نے ایک سفیر کو جو مدینہ سے بھیجا گیا تھا، بے گناہ قتل کر دیا۔ بہرحال اس معلم حکمت و سیاست نے اپنی وفات سے پہلے تمام مخالف طاقتوں کو مغلوب کر لیا اور تمام عرب کو ایک حکومت اور ایک قانون کے تحت جمع کر دیا۔ یہ ایسا واقعہ تھا جس سے اس ملک کی تاریخ کبھی آشنا نہ ہوئی تھی۔ یہ سیاسی معجزہ اُن ہزارہا بندگان خدا کے افکار و اعمال کی کامل وحدت میں نمودار ہوا جو حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ کو سننے کیلئے جمع ہوئے تھے۔ یہ خطبہ جو ۷ مارچ ۶۳۲ء کو عرفات کے میدان میں دیا گیا تھا[2]، انسانی تاریخ کے اہم ترین اعلانات میں سے ایک ہے اور درحقیقت وہ نہایت فخر کا موقع تھا جب خدا کے رسول نے اعلان کیا کہ جو کام صرف ۲۰ سال پہلے شروع کیا گیا تھا وہ اب پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔ اس کے ٹھیک دو مہینے بعد اس مبلغ اعظم نے ۸ جون ۶۳۲ء کو انتقال فرمایا۔

قرآن میں سیاسی استدلال کا طریقہ جس شخص نے عملاً پوری نوع بشری کے طرز زندگی کو بدل دیا، اس کے چند اہم ترین سیاسی کارناموں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اب ہم آسانی کے ساتھ اپنے موضوع کے تمام پہلوؤں پر بحث کر سکتے ہیں۔

---

[1] واقدی بحوالہ میور: "لائف آف محمد" ج ۲ ص ۲۹۹، نیز فتوح البلدان للبلاذری۔ ذکر صلح نجران۔ مجھے طبقات ابن سعد میں اس صلح کا حال نہیں ملا۔

[2] ابن ہشام جلد اول۔ حصہ چہارم۔ ص ۹۶۸۔

ابتدا یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ قرآن مجید میں سیاسی استدلال کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ تاریخی طریقہ ہے۔ نہ صرف عام ہدایات و احکام کی توضیح کے لیے عرب اور اس کے آس پاس کے علاقوں کی تاریخ سے نظائر پیش کیے گئے ہیں، بلکہ جہاں اس کتاب میں کوئی مجرد خیال (Abstract notion) پیش کیا گیا ہے وہاں بھی قریب قریب ہر موقع پر توضیح و تشریح کے لیے ان اقوام کی تاریخ کے نتائج سے استشہاد کیا گیا ہے جن سے اہل عرب واقف تھے، مثلاً عاد و ثمود اور اہل مصر و فلسطین اور روم، عراق و فارس۔ قرآن واضح طور پر قدیم بادشاہیوں اور دوسری قوموں کے حالات میں امتیاز کرتا ہے، اور ہر ایک کے مخصوص اسباب زوال سے بحث کرتا ہے۔ تاکہ وہ بعد والوں کے لیے سبق ہوں۔ مثال کے طور پر قدیم بادشاہیوں میں سے مصر کو بجا طور پر پیش کیا گیا ہے، کیونکہ وہ ایک نہایت قدیم اور نہایت طاقتور سلطنت ہونے کے ساتھ ایک ایسی سلطنت ہے جو اس وجہ سے پارہ پارہ ہو گئی کہ اس نے انسان کی بے حقیقتی اور قانون خداوندی کی قدرت کاملہ سے، جس کا انکشاف چند برگزیدہ ہستیوں پر ہوا تھا، سخت تغافل برتا۔ موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون (علیہما السلام) کو فرعون مصر کے پاس اس لیے بھیجا گیا کہ اس نے قانون الٰہی کے خلاف سرکشی اختیار کی تھی (اِذْهَبَا اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى۔ طٰہٰ: رکوع ۲) اور اس قانون سے بے پروا ہو کر زمین میں ظلم و استبداد شروع کر دیا تھا۔ (وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ۔ یونس، رکوع ۹)۔ اس کے جرائم میں سے ایک بڑا جرم یہ بھی تھا کہ پوری قوم کا نمائندہ بننے کے بجائے اس نے قوم کو بہت سے فرقوں میں تقسیم کر کے ایک فرقہ کو برگزیدہ اور دوسرے فرقہ کو ظلم و ستم سے پامال کیا۔ (اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ

القصص ۔ رکوع (۱)) اس طرح اس نے خدا کی مخلوق کو تفریق و استعباد (Divide and rule) کے اس غیر فطری اور غیر انسانی طریقہ سے ظلم وستم کا تختۂ مشق بنایا جو عارضی طور پر کچھ مدت کے لیے تو کارآمد ہو سکتا ہے، مگر ٹھیک اسی آن ناکام ہو جاتا ہے جس آن لوگوں میں بشری وحدت کا احساس، اور اس تقسیم و تفریق کے نقصان کا شعور پیدا ہو جاتا ہے۔

بنی اسرائیل کی تاریخ سے نظائر پیش کرتے ہوئے قرآن بتاتا ہے کہ خدا نے ان پر اپنے انعامات کی بارش کی، ان کے لیے خود انہی میں سے نہ صرف انبیاء پیدا کیے بلکہ ان کو بادشاہ بھی بنایا[1]، اور جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی وفات کے بعد وہ اپنے وطن سے نکالے گئے اور ان پر ظلم کیا جانے لگا تو ان کو طالوت کی ذات میں ایک بادشاہ عطا کیا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن نے ضمناً ایک اعلیٰ درجہ کے امیر (ڈکٹیٹر) کی خصوصیات کس خوبی کے ساتھ بیان کی ہیں یعنی علم اور طاقت[2]۔ یہ قاعدہ آج بھی اتنا ہی صحیح ہے جتنا ہزارہا برس پہلے تھا۔

قومی زوال کے اسباب | قرآن مختلف قوموں کے واقعی طرز حکومت سے بحث کیے بغیر عمومی طور پر

---

[1] وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنبِيَاءَ وَجَعَلَكُم مُّلُوكًا وَآتَاكُم مَّا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ (المائدہ: رکوع ۴)

[2] أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِن بَنِي إِسْرَائِيلَ مِن بَعْدِ مُوسَىٰ إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِن كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِن دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا ...... إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ...... إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (بقرہ: ۳۲)۔

قوموں کے اسباب زوال بیان کرتا ہے اور یہ عظیم الشان قاعدۂ کلیہ پیش کرتا ہے کہ:۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ (الرعد: ۲)

خدا کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے نفس کی کیفیت کو نہیں بدلتی۔

کائنات کے قوانین بجائے خود ظالمانہ نہیں ہیں۔ ہر قوم کو ابتدا میں کردار صحیح کے حدود بتا دیے گئے ہیں اور ان حدود سے تجاوز ہی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اس قوم کو گرا کر ایک دوسری قوم اٹھائی جاتی ہے[۱] اور یہ قانون فطرت ہے کہ انسانی افراد کی طرح انسانی جماعات کی بھی زندگی و موت مواکرتی ہے۔ جب کسی قوم کی بیماریاں علاج کی حد سے گذر جاتی ہیں، تو افراد انسانی کی طرح وہ بھی ایک بندھے ہوئے قانون کے تحت مرجاتی ہے اور ایک نئی اور زیادہ طاقتور قوم کے لیے جگہ خالی کر دیتی ہے[۲]۔

حکومت الٰہی اور اس کے نتائج یہ بات معلوم و معروف ہے کہ قرآن توحید خداوندی کی تعلیم اور زمین پر خدا کی بادشاہی کے ذکر سے لبریز ہے[۳]۔ اس اصل الاصول میں تین متمیز تصورات شامل

---

[۱] وَلَقَدْ اَہْلَکْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَاءَتْہُمْ رُسُلُہُمْ بِالْبَیِّنٰتِ (یونس: ۲)۔ وَکَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْیَۃٍ وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَہَا قَوْمًا اٰخَرِیْنَ۔ (انبیاء: ۲)۔

[۲]۔ لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ اِذَا جَاءَ اَجَلُہُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَۃً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ (یونس: ۵)۔

[۳] مثال کے طور پر آیات ذیل ملاحظہ ہوں:۔ قُلِ اللّٰہُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ (آل عمران: ۳) وَلِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (آل عمران: ۱۹)، قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِیْہَا اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰہِ قُلْ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ.. ....قُلْ مَنْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّہُوَ یُجِیْرُ وَلَا یُجَارُ عَلَیْہِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (المومنون: ۵) اَلَا اِنَّ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (النور: ۹) وَلِلّٰہِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الحدید: ۱) یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَہُنَّ لِتَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ (الطلاق: ۲) تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ (الملک: ۱) اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحٰکِمِیْنَ (والتین)۔

ہیں جو اس کتاب کے سیاسی پہلو سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں۔

۱۔ توحید خداوندی اپنی عین فطرت کے لحاظ سے وحدت قانونی کو متضمن ہے، اور جیسا کہ قرآن واضح طور پر بتاتا ہے، اس کے قانونی تصورات، کائنات کے اٹل قوانین کلیہ پر مبنی بلکہ ان کے ساتھ متحد الاصل ہیں۔[1] اس لیے یہ قانونی وحدت انہی تصورات پر مبنی ہونی چاہیے۔

۲۔ دوسری چیز جس کو خوب ذہن نشین کر لینا چاہیے، یہ ہے کہ جس طرح ایک بادشاہ کی رعایا کے تمام افراد اس کے ساتھ تعلق رکھنے میں یکساں ہیں اسی طرح خدا کی بادشاہت بھی یہ معنی رکھتی ہے کہ نوع انسانی کے افراد اس کی نسبت سے لازماً ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں۔

۳۔ انسان قانون کلی (Universal Law) کے مقابلہ میں قطعاً بے بس ہے، اور جس چیز کو قانون سازی کہا جاتا ہے اس کے دائرہ میں انسان کا کام اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ اس قانون کلی کے رموز و اسرار کو سمجھنے اور دریافت کرنے کی کوشش کرے، بالکل اسی طرح جس طرح ایک سائنس داں قوائے طبیعی کا اکتشاف کرنے اور ایک ماہر معاشیات انسان اور معاشی ثروت کے درمیان فطری تعلق دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

قانون کلی کی حکومت میں یہ بات بھی آجاتی ہے کہ جو لوگ اس کو تسلیم کریں، یا کم از کم اس کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر راضی ہو جائیں، وہ ہر قسم کے ضرر سے محفوظ ہوں، مگر جو اس کی حدود سے تجاوز کریں وہ اسی طرح سلطنت کی حمایت سے محروم ہو جائیں جس طرح آج کل قانون کی

---

[1] فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ۔ (الروم: ۴)

حد سے تجاوز کرنے والے، سزا، قید، جرمانہ، حتّٰی کہ قتل تک کے متوجب ہوجاتے ہیں۔ خدا پورے جہان کا حقیقی فرمانروا ہے۔ اس کا قانون سب سے برتر اور سب پر محیط ہے، انسان اس کا خلیفہ (Vicegerent) ہے[1] اور وہ انسانی افراد میں سے بادشاہ اور حکام مقرر کرتا ہے جن کا اہم ترین فرض یہ ہے کہ قانون کے مطابق عدل کریں اور کبھی ہوائے نفس کے اتباع میں راہ راست سے نہ ہٹیں[2]۔ یہ تعلیم ہے قرآن کی۔ یہ بے غرض، بے لاگ، بے نفسانہ انصاف کا انتہائی نصب العین ہے، جس نے زمانہ گذشتہ کے طریق عدالت وحکمرانی کو قطعی طور پر رد کرکے ایک نئے دور کا آغاز کیا ایسے دور کا جس میں اس قسم کے عدل کو رعیت کا سب سے زیادہ مقدس حق تسلیم کیا جاتا ہے۔

بے نظمی سے نفرت بہت کم ایسی چیزیں ہیں جن کو قرآن فتنہ وفساد اور بدنظمی سے بڑھ کر نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہو۔ یہ چیز جو انسانی جماعت کے سیاسی وجود کے لیے گھُن کا حکم رکھتی ہے، اُس کی بُرائی کا ذکر اور اس کے استیصال کا حکم قرآن میں جگہ جگہ نہایت کثرت سے آیا ہے۔ ابتدا ہی میں جب خدا اپنے خلیفہ کی حیثیت سے انسان کی تخلیق کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے بڑا شبہ جو ملائکہ کے نفوس میں خلش پیدا کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان زمین میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا[3]۔ پھر دیکھیے۔ خدا بنی اسرائیل سے میثاق لیتا ہے کہ وہ خونریزی نہ کریں گے اور نہ لوگوں کو ان کے گھروں سے نکالیں گے[4]۔ یہ فہمائش متعدد مقامات پر دہرائی گئی ہے[5] غالباً اس لیے کہ انسان

---

[1] وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْاَرْضِ۔ (النمل ۵)۔ [2] يَا دَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (ص : ۲)۔

[3] وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً قَالُوْا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ (بقرہ : ۴)

[4] وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ (بقرہ : ۱۰)۔

[5] مثلاً سورۂ عنکبوت میں ہے وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (رکوع ۴)

اور انسان کے درمیان جو فطری عداوت ہے اُس کو دفع کرنے کے لیے اس کی ضرورت ہے[1]
فتنہ و فساد کو قتل سے زیادہ بُرا کہا گیا ہے[2] اور جو لوگ اس کے محرک ہوں وہ خدا کی لعنت کے
مستحق ٹھیرائے گئے ہیں[3] اور سلطنت کو حکم دیا گیا ہے کہ اگر ممکن ہو تو ان کا زور توڑنے کے لیے پُرامن
طریقے سے کوشش کرے اور ضروری ہو جائے تو بزورِ شمشیر ان کی جڑ کاٹ پھینکے[4]۔ جو لوگ سیاسی اضطراب
برپا کرتے ہیں ان کی اطاعت نہ کرنی چاہیے بلکہ ان کو یا تو قتل کر دینا چاہیے یا سلطنت کے حدود
سے خارج کرنا چاہیے[5]۔ کیونکہ ان کا فعل دراصل خدا اور رسول کے خلاف جنگ کے مترادف ہے[6]
ایک جگہ بیان کیا گیا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو اپنا اور اپنی نسل کا وطن بنایا تو پہلی
دعا جو انہوں نے اپنے خدا سے مانگی، یہ تھی کہ اس کو امن اور خوشحالی کا گھر بنا دے[7]۔ اسلامی نظم
اجتماعی کی کامیابی کا سب سے زیادہ نمایاں مظہر بھی یہی بتایا گیا ہے کہ اس نے ان لوگوں کو ملا کر
ایک کر دیا۔ جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے[8]۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ بالکل متحد ہوں

---

[1] قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (طٰہٰ: ۷)۔ [2] وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ (بقرہ: ۲۷)
[3] فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ أُولٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ (محمد: ۳)۔ [4] وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّٰهِ (الانفال)
[5] وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (الشعراء)
[6] إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ (المائدہ)
[7] وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا ... فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ (ابراہیم)
[8] وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (آل عمران)

(وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا) ایک دوسرے پر مہربان (رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ)
اور ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن کر رہیں (اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ
اَخَوَيْكُمْ) ورنہ ان کا انجام بھی انہی باغیوں کا سا ہوگا جو اپنے دعووں میں خواہ کتنے ہی مصلح پسند
اور امن جو ہوں، مگر دراصل ہر فتنے اور ہر فساد کی جڑ وہی ہیں۔[1]

اسلام کے اصول جنگ، جن کی تشریح، منجملہ دوسرے مقامات کے، سورۂ بقرہ کی
چند مسلسل آیات میں کی گئی ہے[2] دراصل فتنہ و فساد کی اسی مخالفت پر مبنی ہیں۔ وہاں صاف
طور پر یہ بتا دیا گیا ہے کہ جنگ صرف ان کے خلاف کی جائے جو سلطنت کے خلاف جنگ کریں
کیونکہ اندرونی فتنہ قتل سے زیادہ برا ہے، اور تلوار اسی وقت نیام میں کر لی جائے جس وقت
مفسدین اپنی فتنہ پردازی سے باز آجائیں، اور خدائی قانون کی برتری از سر نو قائم ہو جائے۔

امن اور اطاعت | اس قاعدہ کا اطلاق، قرآن مجید کی عین روح سے مطابقت رکھتا ہے جن
بنیادی تعلیمات کو داعی اسلام نے پیش کیا ہے انھیں صرف دو اصطلاحوں کے ذریعہ سے ظاہر
کیا گیا ہے:۔ ایمان اور اسلام۔ ایک کے مفہوم میں "امن کی حکومت" آجاتی ہے، اور
دوسرے کا عین مفہوم ہی "اطاعت" ہے۔ یہ ٹھیک اس تصور کے مطابق ہے جس کو
فرمانروائی (Sovereignty) کا جدید تصور سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ ایک مرکزی
اقتدار کی اطاعت کے بغیر کوئی سلطنت جو سلطنت کہلانے کی مستحق ہو، وجود میں نہیں آسکتی مزید
برآں جبکہ خدا کے قانون کو محیط الکل اور بالاتر تسلیم کر لیا گیا، تو یہ بالکل ایک طبعی بات تھی کہ انسان
کو اسی قانون کے آگے سر تسلیم خم کرنے کا حکم دیا گیا جو خدا کی طرف سے پیغمبر اسلام پر بذریعہ وحی

---

[1] وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ۔ (بقرہ: ۲)۔

[2] ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ رکوع ۲۴۔

منکشف ہوا تھا۔[1] منکرین کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ نام نہاد قانون جو اُن کے آبا و اجداد سے اُن کو ملا ہے، کوئی صحیح اور مناسب قانون نہیں ہے، کیونکہ اس کے بنانے والے کافی دانشمند نہ تھے اور قانونِ کلی کے متعلق ان کا علم اس قدر ناقص تھا کہ وہ راہِ راست نہ پا سکتے تھے۔[2] مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے[3] کہ اگر ان کے درمیان کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے تو ان کو اسی قانون کی طرف رجوع کرنا چاہیے جس کی تشریح پیغمبرِ اسلام نے کی ہے، اس میں ہر وہ چیز ان کو مل جائیگی جس کی انھیں ضرورت ہے۔[4] اس قانون کے لیے محض ایک منفعلانہ اطاعت (Passive obedience) ہی کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس کے متبعین پر یہ فرض بھی عائد کیا گیا ہے کہ خدا کی زمین پر اس کو پھیلانے کی کوشش کریں اور اس کام میں اگر ضرورت پڑے تو اپنا سب کچھ قربان کر دیں، مصیبتیں برداشت کریں، بھوک اور خوف اور تنگی و سختی کا مقابلہ کریں، اور صبر و ثبات کے ساتھ ہر قسم کی مشکلات کا سامنا کریں۔[5] یہ کہنا غیر ضروری ہے

---

[1] وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ (آل عمران: ۱۴) یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (الانفال: ۳) فَاِنْ تُطِیْعُوا اللّٰهُ یُؤْتِکُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا وَاِنْ تَتَوَلَّوْا کَمَا تَوَلَّیْتُمْ مِّنْ قَبْلُ یُعَذِّبْکُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا (الفتح: ۲) مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء: ۱۱)

[2] وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ کَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْـًٔا وَّلَا یَهْتَدُوْنَ (بقرہ: ۲۱)۔

[3] فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا (النساء: ۸)

[4] وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِکَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (البقرہ: ۱۹)

[5] لَا یَسْتَوِی الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ (النساء: ۱۳)

کہ اس قاعدہ کی سب سے زیادہ پیروی خود اس کے معلم ہی نے کی۔ آپ کی مکی زندگی کے مصیبت بھرے ۱۳ سال، مخالفین کی ایذا رسانی، سنگ باری، ظلم و ستم اور سازشوں کے مقابلے میں بسر ہوئے، آخر کار آپ کو اپنے سچے دوستوں کے ساتھ، جو آپ کی ذات میں نیکی و شرافت کا ظہور مجسم دیکھ رہے تھے، مکہ سے دو سو میل کے فاصلہ پر ہمیشہ کے لیے ہجرت کرنی پڑی۔

فرد اور جماعت قرآن انسانی ضروریات کا نہایت صحیح اندازہ کرتا ہے جب وہ منجملہ دوسری باتوں کے اس امر کی تصریح کرتا ہے کہ قانون خداوندی کے اس قاعدہ کی پیروی میں یہ زبردست قربانیاں اگرچہ انفرادی حیثیت سے اشخاص کے لیے کتنی ہی ناگوار اور نامرغوب ہوں، لیکن اس کے باوجود ان کو برداشت کرنے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ مآل کار میں ان کا نتیجہ جماعت کی بھلائی ہے[1] یہ درحقیقت اشارہ ہے اس لازمی منافات کی طرف جو شخصی ضروریات اور اجتماعی ضروریات کے درمیان پائی جاتی ہے، اور جس کی بنا پر اجتماعی مفاد کے لیے بسا اوقات یہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اشخاص کی جان مال اور ہر وہ چیز جس کو ایک شخص دنیا میں عزیز رکھتا ہے قربان کردی جائے۔ اسی اصول کو ایک دوسرے موقع پر قرآن اس طرح بیان کرتا ہے کہ قصاص میں ایک شخص کی موت درحقیقت پوری جماعت کی زندگی ہے[2]۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اس جماعت کے بغیر جان کے تحفظ کی کوئی سبیل نہیں ہوسکتی۔ قرآن کی عام تشریع (Legislation) صرف ایسے جرائم تک محدود نہیں ہے جیسے قتل اور چوری[3]، یا قصاص اور دیت کا وہ قانون جس نے انتقام کے خوگر عرب قبائل کو ایک قوم بنانے اور مختلف نسلوں اور قوموں کو خدائی قانون

---

[1] كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ (البقرہ ۲۶۲)

[2] وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ (البقرہ: ۲۲)۔

[3] السَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا (المائدہ: ۶)

کے تحت ایک ملت اسلامی بنا دینے میں بہت مدد دی ہے، بلکہ وہ شہادت کے وسیع اصول اور قانونی انتقال املاک کے قاعدے بھی وضع کرتا ہے، جیسے وہ قاعدہ جس کے تحت یہ حکم دیا گیا ہے کہ قرض اور ایسے ہی دوسرے مالی معاملات کو تحریر میں لانا چاہیئے[1] نیز یہ ضروری نہیں کہ روزمرہ کے معاملات خرید و فروخت یا قول و اقرار کے لئے بھی تحریر ہو بلکہ دو گواہ اس امر کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ایک معاملہ فی الواقع ہوا ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ نہ صرف ایسے قدیم زمانہ میں جیسا کہ ساتویں صدی عیسوی کا زمانہ ہے، حتیٰ کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور حیات ہی میں اصول قانون نے اس قدر زبردست ترقی کی، بلکہ جو ترقی یافتہ اصول اس وقت وضع کیے گئے تھے انہوں نے قانون کے اُن عمومی تصورات پر بھی ایک پائدار اثر ڈالا جو آج اس جدید زمانے میں رائج ہیں۔

عدل یہاں پہنچ کر ہماری توجہ خود بخود عدل و انصاف کے اس مسلک کی طرف منعطف ہو جاتی ہے جس کو قرآن کے تجویز کردہ نظام میں بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ رسالت کی عین بنیاد ہی قرآن کے بیان کے مطابق انسان اور انسان کے درمیان فیصلہ کرنا ہے۔ اس کا بیان ہے[2] کہ قدیم زمانہ میں شرائع اور کتب آسمانی کے ساتھ انبیاء کی بعثت اسی لیے ہوئی تھی کہ لوگوں کے باہمی اختلافات کا صحیح فیصلہ کریں۔ پیغمبر اسلام اعلان کرتے ہیں کہ ان کو ٹھیک عدل کرنے کا حکم دیا گیا ہے[3] حکام اور قضاۃ کو سختی کے ساتھ ہدایت کی گئی ہے کہ انصاف پر قائم

---

[1] یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْهُ۔ (البقرہ: ۳۹)

[2] فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ (بقرہ: ۲۶) [3] وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ (الشوریٰ: ۲)۔

رہیں اور اپنے ذاتی رجحانات اور تعلقات اور اپنی محبت و نفرت کو انصاف میں دخل نہ دیں[1] گواہوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ پورا پورا حق ظاہر کریں اور اپنی شہادت میں کچھ نہ چھپائیں[2] اس کے ساتھ بقائے امن کے لیے یہ قاعدہ بھی مقرر کیا گیا ہے کہ جو شخص کسی پر جھوٹا الزام لگائے اس کے ساتھ سخت برتاؤ کیا جائے[3]۔ یہ ایسے اصول ہیں جو ہر نظام عدل و قانون کے لیے زینت بخش ہوں گے، خواہ وہ کسی بنیاد پر قائم ہو، اور جو کوئی تعصب سے خالی الذہن ہو کر ان پر غور کرے گا وہ تسلیم کرے گا کہ یہ ایسے اصول کلیہ ہیں جن کا اطلاق تمام جہان کے معاملات پر ہو سکتا ہے۔

اصلاح تمدن اور سیاسیات اس مضمون کے دائرہ میں ان تمام تمدنی اصلاحات کو بیان کرنا مشکل ہے جو قرآن نے ایک ایسی سوسائٹی میں انجام دیں جو قبیلہ کی حدود سے باہر کسی حق اور کسی فرض سے آشنا نہ تھی۔ جو چیز قطعی ناممکن معلوم ہوتی تھی اس کو قرآن نے اس طرح پورا کر دکھایا کہ جو ایک دوسرے کے دشمن تھے ان کو بھائی بھائی بنا دیا، جن دلوں کو نفرت و عداوت نے پھاڑ دیا تھا ان کو الفت و محبت سے جوڑ دیا، اور جو ہاتھ ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے ان کو برادرانہ تعاون کے رشتہ میں باندھ دیا[4]۔ قرآن ان سب لوگوں کو جو خدائی قانون

---

[1] یا ایها الذین امنوا کونوا قوامین بالقسط ولا یجرمنکم شنان قوم علی ان لا تعدلوا اعدلوا هو اقرب للتقوی۔ (المائدہ: ۲) ان الله یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اهلها واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل (النساء ۸)

[2] ولا تکتموا الشهادة ومن یکتمها فانه آثم قلبه (البقرہ: ۳۹)۔

[3] الذین یرمون المحصنت ثم لم یاتوا باربعة شهداء فاجلدوهم ثمنین جلدة ولا تقبلوا لهم شهادة ابدا (النور ۱)

[4] واذکروا نعمة الله علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمته اخوانا۔ (آل عمران: ۱۱)۔

کی اطاعت قبول کریں، سختی کے ساتھ ہدایت کرتا ہے کہ اللہ کی رسی کو مضبوط تھامے رہیں اور ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں[1]۔ نیز وہ اُن کو تعلیم دیتا ہے کہ اچھے کاموں میں ایک دوسرے کی اعانت کریں، اور برے کاموں میں نہ صرف معاونت سے انکار کردیں، بلکہ جو لوگ اس طرف مائل ہوں اُن کو بھی روکیں[2]۔ مختصر یہ کہ مسلمانوں کا فرض یہ ہے کہ ہر اُس چیز کی تحریک وتائید کریں جو نیک ہو اور ہر اُس چیز کو روکیں جو بری ہو[3]۔ اصلاح تمدن ومعاشرت میں قرآن کی ہدایات نہایت مفصل ہیں حتیٰ کہ وہ اتنی تفصیلات میں بھی جاتا ہے کہ جو شخص کسی کے مکان میں داخل ہونا چاہتا ہو اس کا فرض ہے کہ پہلے صاحب مکان سے اجازت لے[4] گھر کے لڑکے بھی خاص مواقع پر جبکہ تم کو تخلیہ کی ضرورت ہوتی ہے بلا اجازت تمہارے پاس نہ آئیں[5]۔ تاجروں کو تاکید کی گئی ہے کہ ناپ تول میں سخت احتیاط برتیں اور اشیاء کو فروخت کرتے وقت معیاری اوزان اور پیمانے استعمال کریں[6]۔ چوری، زنا، قتل اطفال، اور بہتان وافترا کے استیصال پر خاص توجہ کی گئی ہے[7] اور ایسی ہی سینکڑوں تمدنی اصلاحات

---

۱ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا (آل عمران: ۱۱)۔ ۲ تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ (المائدہ ۱) ۳ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۲)۔ ۴ لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰى اَهْلِهَا (النور: ۴) ۵ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَاءِ ..... وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (النور: ۸)۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ آج ان اصولوں کو خود غیر مسلم اہل مغرب نے اپنی تہذیب میں اختیار کرلیا ہے۔

۶ يٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاۗءَهُمْ (ھود: ۸)۔ ۷ بیعت عقبہ اولیٰ کے موقع پر خصوصیت کے ساتھ ان چیزوں سے احتراز کا عہد لیا گیا تھا۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ عورتوں سے بھی بیعت لیتے وقت ان چیزوں سے پرہیز کا اقرار کرائیں (الممتحنہ ۲)

اس کتاب میں پھیلی ہوئی ہیں، اور قابل لحاظ امر یہ ہے کہ ان کو محض تخیلات کی حیثیت سے پیش نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اُن عربوں سے جو فخر و غرور کے نشہ میں سرشار تھے اِن کے مطابق عمل کرا کے چھوڑا گیا، اور اس طرح جو لوگ پہلے محض وحشی گلہ بان تھے ان کو تہذیب کے ایسے بلند مرتبہ پر پہنچا دیا گیا کہ وہ اعلیٰ درجہ کے مدبر، سپہ سالار، حاکم، تاجر، اور عصائے سیاست کے مالک بن گئے، حتیٰ کہ ان قوموں سے بھی آگے نکل گئے جو ہزارہا سال کی پُرانی تہذیب کے مالک ہونے پر فخر کرتے تھے۔

شوریٰ اگرچہ قرآن اس کا اعلان کرتا ہے کہ وہ وحی خداوندی اور کشف اسرار و حقائق ہے، لیکن اس کے باوجود قرآنی سلطنت میں شوریٰ کے لیے ایک جگہ اور بہت ہی اہم جگہ ہے جہاں اچھے مسلمانوں کی خصوصیات چند نہایت عمدہ آیتوں میں بیان کی گئی ہیں، جہاں ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ اللہ پر توکل کرنے والے ہیں، جہاں فواحش اور کبائر سے اجتناب پر ان کی تعریف کی گئی ہے، جہاں ان کی بہادری و شجاعت اور اپنے حقوق کے دفاع میں ان کی شہامت کو سراہا گیا ہے وہیں ان کی یہ خصوصیت بھی مدح کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنے معاملات میں باہم مشورہ کرتے ہیں (وَ اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ) یہی نہیں بلکہ جہاں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہدایت کی گئی ہے کہ جب وہ کسی امر کا عزم کرلیں تو خدا کے بھروسہ پر اس کو کر گذریں وہیں آپ کو یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ مسلمانوں حتیٰ کہ منافقوں تک سے مشورہ لیں[1] یہی وہ ٹھیک ٹھیک جمہوری اسپرٹ ہے جس میں صرف تعداد آراء کا ہی نہیں بلکہ رائے دینے والوں کی اہلیت کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے۔ جس نے قرآن کے مذہب کو تمام دنیا پر چھا جانے کے قابل بنا دیا۔ اگر اسکے الفاظ اور اسکی اصطلاحات کثرت سے نہیں پھیلیں تو کیا ہوا۔

[1] فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (آل عمران: ۱۷)۔

اس کے پیش کردہ اصول تو دنیا بھر میں قبول کر لیے گئے۔ اسی اسپرٹ کا مزید اظہار ان اصول سے ہوتا ہے جو قرآنی محاصل (Taxation) کی بنیاد ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پیغمبر اسلام نے خود جیسی سادہ زندگی بسر کی اس کے لحاظ سے قرآن کے تجویز کردہ نظم حکومت کو چلانے کے لیے بہت کم محاصل کی ضرورت تھی، اور وہ ہر زمانے کے لیے ایک ایسی حکومت کا بہترین نمونہ تھا جو ایک طرف نہایت اعلیٰ درجہ کی کارپرداز (Efficient) ہو اور دوسری طرف کم سے کم مصارف پر چلائی جائے۔ قرآن میں جن محاصل کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہیں:

(۱) زکوٰۃ، جو ہر صاحب نصاب مسلمان کی سالانہ بچت میں سے بحساب ۲½ فی صدی لی جاتی ہے۔

(۲) جزیہ، جو غیر مسلم رعایا پر فوجی خدمت سے استثناء کے معاوضہ میں عائد کیا جاتا ہے۔

(۳) خراج یعنے زمین کا لگان۔

ان کے علاوہ جنگ کے انفال اور غنائم ہیں جن کو مستقل ذرائع آمدنی میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ زکوٰۃ اور غنائم کے لیے قرآن نے تصریح کر دی ہے کہ ان کو اس طرح تقسیم کیا جائے کہ مال ایک جگہ جمع نہ ہونے پائے بلکہ سوسائٹی کے مفلس طبقوں میں پھیل جائے۔ ان میں سے صرف ایک حصہ حکومت کے نظم و نسق کے لیے مقرر کیا گیا ہے[1]۔ باقی مصارف کے لیے حکومت کو دوسرے ذرائع آمدنی پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔

بین الاقوامی معاملات قرآن کی جامعیت اور مسائل حیات پر اس کی احاطت کا صحیح اندازہ

---

[1] اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۔ (التوبہ: ۸)۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (الانفال: ۵)۔

ہم کو اس وقت ہوتا ہے جب ہم بین الاقوامی معاملات، قوانین جنگ، سفارتی تعلقات اور معاہدات کے متعلق اس کے قوانین پر نظر کرتے ہیں۔ یہاں اُس مبتذل الزام کی تردید میں کچھ کہنا بے محل ہوگا جو اسلام پر لگایا جاتا ہے کہ اس کی اشاعت تلوار سے ہوئی ہے، کیونکہ ایسے امور پر بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہم اپنی گفتگو کو صرف ان ہدایات تک محدود رکھیں گے جو قرآن نے عام بین الاقوامی تعلقات کے باب میں دی ہیں۔ پہلا قاعدہ جو پیغمبر اسلام پر وحی کیا گیا، یہ تھا کہ جنگ کی اجازت اس لئے دی گئی کہ مسلمانوں پر ان کے مخالفین نے زیادتی کی ہے[1]۔ اور جنگ صرف ان لوگوں کے خلاف کی جائے جنہوں نے ظلم کیا ہے[2]، اور اس وقت تک کی جائے کہ فتنہ باقی نہ رہے[3]۔ اور اگر دشمن صلح کی درخواست کرے تو اس کو قبول کرنے سے انکار نہ کیا جائے[4]۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کی یہ پالیسی نہیں ہے کہ مسلمان کسی حال میں قانون ملّی کے دشمنوں سے موالات کریں۔ جب ان سے جنگ کا اعلان ہو جائے تو انہیں کوئی پناہ نہ دی جائے تاوقتیکہ ان کا زور ٹوٹ نہ جائے[5]۔ مجاہدین جو ہر اس چیز کی مدافعت پر مامور ہیں جسے وہ مقدس اور عزیز سمجھتے ہیں، بہترین اجر کے امیدوار بنائے گئے ہیں[6]۔

---

۱ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (الحج: ۶) ۲ لَا یَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَیْهِمْ (الممتحنہ: ۲)
۳ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ (البقرہ: ۲۴) ۴ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (الانفال: ۸)۔ ۵ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْیَجِدُوْا فِیْكُمْ غِلْظَةً (التوبہ: ۱۶) فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (محمد: ۱) ۶ فَلْیُقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یَشْرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَةِ وَمَنْ یُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیُقْتَلْ اَوْ یَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا (النسآء: ۱۰)

اس موقع پر یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ وحی کی ہدایت سے غیر مسلموں کی دو جماعتوں میں فرق کیا گیا ہے، ایک جماعت وہ ہے جو متبعین اسلام سے کوئی معاہدہ کرے اور اس پر قائم رہے اس کے ساتھ عہد پورا کرنے کا حکم ہے۔ اور مسلمانوں کو سخت تاکید کی گئی ہے کہ کسی حال میں عہد شکنی کا ارتکاب نہ کریں دوسری جماعت وہ ہے جو مسلمانوں کے ساتھ عہد کر کے اسے توڑ دے اور ان کے خلاف ہتھیار اٹھائے، اس سے آخر وقت تک لڑنے کا حکم ہے[1]۔

جب ہم اُن فیاضانہ مراعات کی طرف توجہ کرتے ہیں جو قرآن نے اسیرانِ جنگ کے ساتھ برتنے کی ہدایت کی ہے تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب نے انسانی سوسائٹی کی سیرت کو بلند کرنے میں کس قدر نمایاں کام کیا ہے۔ جنگ بدر پہلی جنگ ہے جس سے اس قاعدہ کی ابتدا ہوئی کہ اسیرانِ جنگ کو نہ صرف زندہ اور آرام رکھا جائے بلکہ ان کو ایک قلیل معاوضہ پر چھوڑ بھی دیا جائے، خواہ وہ زر فدیہ ہو یا کوئی ایسی مفید خدمت جیسے بچوں کو پڑھنے لکھنے کی تعلیم دینا[2]۔ وہی عرب جن کے مرد تو مرد، عورتیں تک زخمیوں اور مقتول لاشوں پر بھی رحم نہ کھاتی تھیں[3]، چند سال کے اندر اس قدر مہذب اور شریف طینت بنا دیے گئے کہ جب پیغمبر علیہ السلام

[1] بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ..... وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ ..... اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ..... وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ..... فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ..... كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ..... وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ (التوبہ: ۱-۲۰)

باقی حاشیہ صفحہ آئندہ

اپنے دس ہزار جان نثاروں کے ساتھ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے۔ تو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے شدید احکام کی اطاعت میں انہوں نے ان ظالموں میں سے کسی کو ہاتھ تک نہ لگایا جنہوں نے آٹھ سال پہلے انہیں اسی شہر سے سخت ظلم و ستم کے ساتھ نکالا تھا۔[۱]

رواداری اب ہم رواداری کے اس عظیم قاعدے کی طرف آتے ہیں جس کی نہایت بلند مرتبہ تعلیم قرآن نے دی ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ابھی یہ ساتویں صدی عیسوی کا ہی زمانہ تھا، اور دنیا اس زمانہ میں مذہبی اعتقادات میں رواداری کے اصول سے قطعی ناآشنا تھی۔ جیساکہ ہم اس مقالہ کے ابتدائی حصہ میں بتا چکے ہیں اسی زمانہ میں بازنطیم اور ایران کی عظیم الشان سلطنتیں اپنی رعایا کو جبراً اپنے مذہب کا پیرو بنانے کے لیے وہ سب کچھ کر رہی تھیں جو ان کے امکان میں تھا۔ بلکہ ابھی اس کے کئی صدی بعد بھی دنیا کو حروب صلیبیہ، اور جرمنی اور دوسرے ممالک کی مذہبی لڑائیوں اور اسپین کی مذہبی عدالتوں (Inquisition) اور سکسنی اور دوسرے ممالک فرنگ کے جبری تبدیل مذہب، اور انگلستان میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کی خون آشامیوں کے دور سے گذرنا تھا۔ پس درحقیقت اصول سیاست کی تاریخ میں یہ ایک نرالی اور حیرت انگیز چیز تھی کہ قرآن نے انسان کے مذہبی معتقدات میں اختلاف اور گوناگونی کو بطور ایک ناقابل تبدیل حالت کے تسلیم کر لیا، اور اس مسئلہ کی بنیاد پر ہر زمانہ کے لیے یہ عظیم الشان قاعدہ کلیہ مقرر کر دیا کہ مذہب کے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ [۱] قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ (الانفال ۸-۷۰) [۲] ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے جنگ احد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ کا پیٹ اور ان کا کلیجہ نکال کر چبا ڈالا۔ دیکھو ابن ہشام جلد ۲۔ صفحہ ۵۵۵)

حاشیہ صفحہ ہذا۔ [۱] فتح مکہ کے حالات میں ملاحظہ ہو ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۸۰۲)۔

معاملہ میں کوئی جبر و اکراہ نہ ہونا چاہیئے[1] جس طرح موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ فرعون کے سامنے نرمی کے ساتھ تلقین و تبلیغ کریں[2]۔ اسی طرح مسلمانوں کو بھی ہدایت کی گئی ہے کہ جو شخص ان کا ہم مذہب نہ ہو اس کے سامنے تبلیغ دین میں نہایت شایستہ اور نرم طرز کلام اختیار کریں[3]۔ یہ خیال رہے کہ اس اصول کی تعلیم اس شخص کی زبان سے دی گئی ہے جو خود مذہب ہی کی وجہ سے ہر قسم کے ظلم و ستم کا تختہ مشق بنایا جا رہا تھا! اس نے کہا کہ اگر آبادی کا صرف ایک حصہ اس دین کو قبول کرے جو مجھے اور میرے متبعین کو سب سے بڑھ کر عزیز ہے تو دوسرے حصہ کی روش کے متعلق میں نہایت صبر کے ساتھ خدا کے فیصلے کا انتظار کروں گا[4]۔ اگرچہ مسلمانوں کو ایسے لوگوں کی دوستی سے منع کیا گیا ہے جو مخالف کیمپ سے تعلق رکھتے ہیں یا اپنی روش میں منافق ہیں[5] لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن ان میں اور ایسے لوگوں میں فرق کرتا ہے جو غیر مذہب کے تبع ہونے کے باوجود اپنے پیشواؤں کی تعلیم کے مطابق منکسر اور حلیم الطبع ہوں، جیسے کہ اس زمانہ کے بعض عیسائی تھے[6] کفار مکہ سے ایک

---

[1] لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (البقرہ: ۳۴) وَمَا أَنتَ عَلَيْهِم بِجَبَّارٍ (ق: ۳)۔

[2] فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ۔ (طٰہٰ: ۲)۔

[3] ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (النحل: ۱۶)

[4] وَإِن كَانَتْ طَائِفَةٌ مِّنكُمْ آمَنُوا بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ وَطَائِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوا فَاصْبِرُوا حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا (الاعراف: ۱۱)

[5] يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ (آل عمران: ۱۲)

[6] وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ۔ (المائدہ: ۱۱)۔

پوری سورۃ میں خطاب کیا گیا ہے اور اس کا اختتام اس قاعدۂ عظیم و جلیل پر ہوتا ہے جو ان کے سامنے پیش کیا گیا کہ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ۔ اب یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اگرچہ اس مصالحانہ قاعدہ کی تعلیم کے بعد سے تمام دنیا کے مذہبی افکار کا میلان اسی کے کلی اطلاق کی طرف ہو گیا ہے، لیکن ہمارے اس جدید دور میں بھی دنیا کے متعدد علاقے ایسے موجود ہیں جو مذہبی جبر و ظلم کی قدیم وحشیانہ اسپرٹ کا اظہار کر رہے ہیں، اور ایک ہی ملک کے باشندوں کو جو ایک ہی زبان بولتے ہیں محض اس لیے دھکے دیے جاتے ہیں کہ اتفاق سے وہ اس مذہب کے معتقد نہیں ہیں جو اکثریت کا مذہب ہے[۱]۔

بین الاقوامیت | بین الاقوامیت کا اصول وہ آخری اصول ہے جس کی میں یہاں تشریح کرنا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، قرآن مجید کے اصول جس زمانہ میں تعلیم کیے گئے وہ ایسا زمانہ تھا کہ نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا متحارب قوموں، فرقوں اور طبقوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اس حالت میں قرآن نے انتہائی بین الاقوامیت کی تعلیم دے کر ایک بالکل نئی چیز دنیا کے سامنے پیش کی۔ یہ ایک غایت درجہ کا بے باکانہ اقدام تھا، مگر یہ اسی قسم کے اقدامات میں سے تھا جن کا اظہار قرآن مجید نے اپنے دوسرے اصولوں کی تعلیم میں کیا ہے۔ بلاشبہ قرآن اس اصول کو تسلیم کرتا ہے کہ انسان طبقات میں منقسم ہیں اور درجات کی کمی و بیشی حق بجانب ہے تاکہ شخصی قابلیتوں کو آزمائش کا پورا موقع مل سکے[۲]۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ قطعیت کے ساتھ کہتا ہے کہ فرقوں اور باہم جنگ کرنے والے عناصر

---

[۱] آج اس روشن زمانہ میں نازی جرمنی کا یہی حال ہے۔

[۲] هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ (الانعام: ۲۰)
انْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ (بنی اسرائیل)۔

کا وجود دراصل قانون الٰہی سے انحراف اور تجاوز کرجانے کی سزا ہے[۱]۔ جتنے شعوب وقبائل دنیا میں موجود ہیں، اپنی طبیعی اصل کے اعتبار سے یکساں ہیں،[۲] اور ان کے امتیازی خصائص کا بقا صرف اس غرض کے لیے درست ہے کہ انسان اور انسان کے درمیان تمیز ہوسکے۔ باقی رہی فضیلت اور شرافت وبزرگی تو قرآن صاف کہتا ہے کہ وہ کسی نسل، کسی قبیلے، کسی خاندان اور کسی قوم سے تعلق رکھنے کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اعلیٰ سیرت اور نیک کردار کی بنا پر ہے۔[۳] جس شخص نے خود اپنی پھوپھی زاد بہن کی شادی ایک غلام سے کردی، جو شخص ایک غلام زادے کو اشراف قریش کی فوج کا سپہ سالار بنا سکتا تھا،[۴] جو شخص اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں اپنی قوم کے ایک نہایت غریب آدمی کی سی زندگی بسر کرسکتا تھا جس کے دل میں کمزوروں اور پست حال لوگوں کی بھلائی کے سوا کوئی اور خیال نہ تھا، ایسے شخص کا طرزعمل خود ہی پرانی حد بندیوں کی شکست کا ایک زندہ نمونہ تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ بین الاقوامی تخیل کے حامیوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ نسل، زبان اور جغرافی تقسیموں کی بظاہر ناقابل عبور حد بندیاں ہیں۔ اور تخیلات خواہ کتنے ہی مقدس ہوں، مگر انسان اپنے روز افزوں ذرائع کے باوجود آج تک ان رکاوٹوں

---

[۱] اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ (الانعام: ۶۵)۔

[۲] يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ۔ (الحجرات: ۱۳)

[۳] حضرت زینب بنت جحش، عبدالمطلب کی نواسی جن کی شادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ کے ساتھ کردی تھی۔

[۴] سریۂ موتہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کے بیٹے اسامہ کو اس فوج کا سپہ سالار بنایا جس میں اکابر صحابہ شریک تھے۔

پر غالب آنے اور ان تصورات کو حقیقت بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے جن کا اشتہار

"انسان کی پارلیمنٹ اور عالمگیر وفاق"

کے دل خوش کن عنوانات سے وہ بڑے زور شور کے ساتھ دے رہا ہے لیکن پیغمبر اسلام نے نوع انسانی کو ایک راستہ دکھایا، قانون کلی کا راستہ، جس کو نسل وطن زبان اور جغرافی اشکال کی تمام شدید حد بندیوں کے باوجود تمام انسان قبول کر سکتے ہیں[1] اور آپ نے خود روم، حبش، فارس اور عرب کے لوگوں کو اس قانون کی اطاعت میں جمع کر کے نہ صرف ایک بلند تخیل پیش کیا بلکہ اس کو عملی جامہ پہنا کر بھی دکھا دیا، جس کی نظیر آج تک کوئی دوسرا انسان پیش نہ کر سکا[2] صلی اللہ علیہ وسلم۔

---

[1] اس خاص مسئلہ کی تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو رسالہ ترجمان القرآن (حیدرآباد) جلد سوم بابت ماہ رجب و شعبان ۱۳۵۲ھ

[2] قانونی افکار پر اسلام کے اثرات کی تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو The Legacy of Islam Clarendon Press. Oxford 1931. میں پروفیسر De Santillana کا مضمون (Law and Society)

کَافَّةً لِّلنَّاسِ

بہ تقریب عید میلاد النبیؐ

از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز بی اے ہوم ڈپارٹمنٹ شملہ

یوں تو ہر شکار میں ایک لطف ہے لیکن سب سے زیادہ لطف انسان اسوقت محسوس کرتا ہے جب کہ اس کا شکار خود دوسرا انسان ہو۔ نوع انسانی کی تاریخ پر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ وہ اسی سلسلۂ صید وصیاد کی ایک مسلسل داستان ہے تہذیب و تمدن کے بدلنے سے محض جال کی نوعیتیں بدلتی رہی ہیں۔ لیکن جذبہ ہمیشہ وہی کارفرما رہا ہے۔ انسان نے اپنے عہد طفولیت میں شکار اور گلہ بانی کی انفرادی زندگی کے بعد قبائل کی اجتماعی زندگی کی طرف قدم بڑھایا تو اس اجتماعیت اور عمرانیت کا تقاضا تھا کہ آپس میں کچھ کام بانٹ لیے جائیں مختلف لوگ مختلف مقتضیاتِ زندگی کے ذمہ دار ہوں یہ تقسیم عمل تھی جس سے ابتداءً انسانی گروہوں کی تخلیق ہوئی لیکن چونکہ فرائض مفوضہ کی نوعیت میں اختلاف تھا۔ کچھ فروتر تھے کچھ بالاتر۔ جن لوگوں کے حصہ میں بالائی سطح کے فرائض آئے، انہوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ چوپاؤں کی سیاقت میں ذہنی تعیش کہاں جو خود انسانوں کی سیادت میں ہے۔ درندوں کے شکار میں وہ لذت کہاں جو اپنے ہم جنسوں کے لہو میں ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایسی تدابیر سے کام لینا شروع کیا کہ ہاتھ آئی ہوئی دولت کبھی چھننی ہی نہ جائے۔ یہیں سے حکومت کی بنیاد پڑی اور ارباب اقتدار نے اپنی سطوت و تغلب کو قائم رکھنے کے لیے مختلف قوتوں کو اپنے اند

مرکوز کرنا شروع کر دیا۔ اس انداز سے ان کی گرفت مضبوط تو ضرور رہتی لیکن جو کاوشیں اور زحمتیں اس قوت کے حصول اور استبقاء میں برداشت کرنی پڑتیں وہ مشکل "باندازۂ خمار" ہو سکتیں، لہٰذا ایک دیدہ ور اور دوربین گروہ نے اس سے بھی زیادہ موثر طریقہ کی بنیاد رکھی انہوں نے دیکھا کہ عقیدہ انسان کا سب سے زیادہ نازک پہلو ہے اس کے راستہ سے جو چیز ذہن انسانی میں داخل کیجائے گی اس کی گرفت کبھی چھوٹ ہی نہیں سکتی۔ ادھر مختلف گروہ کچھ وقت سے اپنے اپنے فرائض سرانجام دیتے دیتے ان کے خوگر بھی ہو چکے تھے۔ ہنر اور پیشہ وشتہ بھی ملتا چلا آ رہا تھا۔ ماحول کا بھی اثر تھا۔ ان حالات کے یکجا اجتماع سے ایک عقیدہ کا وجود میں آجانا کچھ زیادہ مشکل نہ تھا۔ چنانچہ تقسیم عمل کی وہ حدبندی جس کی ابتدا محض ایک آنی ضرورت تھی ایمان کا جزو ہو گئی فروتر گروہ میں پیدا ہونے والے بچہ کے ذہن میں شروع سے ہی یہ بات راسخ ہونے لگجاتی تھی کہ اس گھرانے میں اس کی پیدائش دیوتاؤں کے حکم سے ہے اور کسی انسان کو یہ اختیار باقی نہیں کہ ان کے فیصلے کے خلاف اپیل سن سکے مفلسی اور محتاجی کی صعوبات اذلت ورسوائی کی عقوبات جو اس پیشہ اور گھرانے سے متعلق ہونے کی جہت سے اس پر آتیں وہ اطمینان اور قناعت سے ان کو جھیلتا کہ وہ اس کے کسی گذشتہ جنم کے اعمال بد کی پاداش میں آتی ہیں۔ اعلیٰ طبقہ میں پیدا ہونے والا بچہ دنیا کی تمام نعمتوں اور ثروتوں کو اپنا پیدائشی حق سمجھتا اس لیے کہ وہ اس ورن میں پیدا ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ اپنے کسی گذشتہ جنم کے نیک اعمال کا معاوضہ لے۔ یہ تقسیم الٰہی تقسیم تھی، جس میں کسی کو شکوہ و شکایت کی گنجائش نہ تھی۔ اعلیٰ طبقہ فروتر گروہوں سے ہر قسم کی خدمت لینا اپنا حق سمجھتا تھا، اور فروتر گروہ ان کی طرف سے ہر قسم کے جور و استبداد کو خدا کا بھیجا ہوا مقدر سمجھتا تھا۔ نہ وہ اس خدمت کا معاوضہ دینا ضروری خیال کرتا، نہ یہ اس استبداد کے خلاف لب کشائی کرنے کی جرأت کر سکتا۔ رفتہ رفتہ یہ عقیدہ اس قدر راسخ

ہوگیا کہ گروہوں کی تقسیم ابدی اور ازلی قرار پاگئی۔ اب ارباب اقتدار کو ہر طرح کا اطمینان حاصل تھا۔ ان کی بالادستی کے خلاف کسی کے دل میں خیال تک بھی نہیں آسکتا تھا۔ لہذا وہ تغلب جو دنیا بھر کی قوتیں اور ہزاروں سامان فراہم کرنے کے بعد بھی وہ حاصل نہ کرسکتے تھے، اب بلا محنت اور تردد، بلا خدشہ و اندیشہ گھر بیٹھے ان کو حاصل تھا، اور اس انداز سے کہ ان کے چھن جانے کا کبھی گمان تک بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ مصر کے عہد اولین کی تاریخ دیکھیے عام انسانوں کے چار طبقوں کے علاوہ جن میں بجائے خود تفوق و برتری کے مدارج کچھ کم متمیز نہ تھے، پانچواں گروہ ارباب حکومت کا تھا۔ بادشاہ دیوتاؤں کی طرف سے بادشاہ ہوتا تھا، اور اس کی اولاد پیدائشی حاکم ہوتی تھی۔ نہ اُس کو کبھی یہ دھڑکا ہوتا تھا کہ رعایا میں سے کوئی اس کے خلاف بغاوت کا خیال تک بھی لاسکتا ہے۔ نہ رعایا میں سے کسی کو وہم تک بھی ہوسکتا تھا کہ ان میں سے بھی کبھی کوئی بادشاہ بن سکتا ہے۔ اس کے بعد ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالیے چار ورنوں کی ابتدا کچھ اسی طرح ہوئی ہوگی لیکن رفتہ رفتہ طبقۂ اعلیٰ یعنی برہمنوں کا تسلط تمام قلوب پر چھا گیا۔ شودر اور ویش اپنی اپنی حالت پر مطمئن تھے کہ وہ اپنے ورن سے باہر جا ہی نہیں سکتے تھے۔ اور ان کا کام ہی طبقۂ اعلیٰ کی خدمت گذاری تھا۔ کشتری یقیناً سپاہی اور حکمراں تھے لیکن ان کا فریضہ بھی برہمنوں کی حفاظت اور کفالت تھا۔ درحقیقت حکومت تمام برہمنوں ہی کی سرپرستی میں ہوتی تھی۔ اور جو کچھ کشتری سورماؤں کے پاس تھا، وہ وہی تھا جسے برہمنوں نے دوسری سمجھ کر خود بخود چھوڑ رکھا تھا۔

لیکن انسانوں کی اس غیر فطری تقسیم سے تخلیق انسانی کا مقصد ہی فوت ہو رہا تھا۔ ارادہ و اختیار کا دائرہ جو انسان کو دیگر مخلوقات پر شرف بخشنے کے لیے اسے عطا کیا گیا تھا، وہ اس تقسیم سے یکسر مٹ چکا تھا۔ امکانات انسانی کے تمام راز سربمہر دھرے رکھے تھے۔ ذہن و قلب کی تمام قوتیں معطل اور بیکار تھیں۔ اس لیے کہ نیچی ذات کے لوگ کبھی ترقی کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔

پھر قوتوں کے استعمال کا موقع کہاں سے آتا۔ اعلیٰ طبقے کے لوگ اپنے طبقے کو انسانی ترقیوں کا آخری نقطہ سمجھ کر مطمئن تھے کہ اس سے آگے بڑھنا اس دنیا کے انسانوں کے بس میں ہی نہیں وہ دیولوک (دیوتاؤں کی دنیا) کا کام ہے۔ گویا انسانوں کی تمام جماعتوں پر جمود اور تعطل کے تو بڑ پردے پڑے ہوئے تھے جن کو اتنا مقدس اور پوتر سمجھا جاتا تھا کہ انسانی ہاتھ ان کو چھو بھی نہیں سکتا تھا۔ فطرت اسے کب تک گوارا کرتی مختلف زمانوں میں مختلف مقامات پر اس کے خلاف آوازیں بلند ہوئیں کہیں کم موثر ثابت ہوئیں کہیں زیادہ لیکن رفتہ رفتہ عقیدۂ تناسخ مختلف شکلیں تبدیل کرتا چلا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی پیدائشی امتیازات اس صورت میں باقی نہ رہے جو اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ تھا۔ البتہ اس کے دھندلے سے نشان نسبی امتیازات کے رنگ میں موجود رہے لیکن ہندوستان میں اگرچہ مختلف آوازیں بھی اس کے خلاف پیدا ہوتی رہیں، اس عقیدے اور عقیدے کے لازمی نتائج میں ذرہ بھی فرق نہ آیا۔ ہمیں اس وقت اُن آوازوں کی تفصیل و تاریخ سے بحث نہیں جو اس کے خلاف پیدا ہوئیں لیکن ان کا نتیجہ تو ظاہر ہے۔ مثلاً مہاتما بدھ کی کوشش اس باب میں کچھ کم قابل تحسین نہیں لیکن آخری ماحصل تو یہی ہے تاکہ ورن اپنی جگہ قائم رہا اور بدھ مت کو چین اور جاپان کی طرف جانا پڑا۔ ہمیں اس وقت صرف اس آواز کو دیکھنا ہے جو سب سے موثر طریق سے اٹھائی گئی اور سب سے زیادہ موثر نتائج کی حامل ہوئی۔ یہ وہ آواز ہے جو آج سے چودہ سو سال پیشتر عرب کے صحرا سے بلند ہوئی۔

وہ عرب کہ جہاں نسبی تفاخر اپنی انتہا پر تھا۔ عہد جاہلیت کے دواوین اٹھا کر دیکھیے معلوم ہوجائے گا کہ پیدائشی امتیازات ان کے ہاں کس قدر اہمیت رکھتے تھے۔ یہ آواز اس ہستی کی وساطت سے بلند ہوئی جو اس تمام ملک میں سب سے زیادہ ممتاز اور اعلیٰ ترین قبیلہ سے تھی مروجہ عقائد کی رو سے جس کو سب سے بڑھ کر تفوق و امتیاز پیدائشی طور پر حاصل تھا۔ اس

باطل تفوق کے خلاف اگر کوئی آواز سب سے زیادہ موثر ہو سکتی تھی تو کسی ایسی ہی شخصیت کی ہو سکتی تھی۔ اسلام نے سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ یاد رکھو پیدائش کی رو سے تمام انسان برابر ہیں۔ کسی کو کسی پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ اس لئے کہ تمام انسان ایک نفس واحد سے مخلوق ہیں۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ.. (۷/۱۸۹) وہی ہے جس نے تم کو نفس واحد سے پیدا کیا

پھر اس کے بعد یہ بتایا کہ مختلف وطن۔ قبائل۔ قومیں۔ ذاتیں۔ سب اس لئے ہیں کہ ایک دوسرے کی پہچان ہو سکے۔ ان میں سے کوئی چیز عزت و تکریم کی باعث نہیں۔ نہ شودر کا شودر کے گھر پیدا ہونے سے ذلیل ہے نہ برہمن برہمن کے ہاں جنم لینے سے پوجیہ پاد۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (۴۹/۱۳) لوگو ہم نے تم کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا۔ اور تمہاری برادریاں اور کنبے بنا دیئے کہ آپس میں شناخت کر سکو۔ تم میں سب سے زیادہ بزرگ اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

پھر یہ اعلان کیا کہ یاد رکھو اس دنیا میں انسان ایک صاف لوح لے کر آتا ہے کسی گذرے ہوئے جنم کے اعمال کے نتائج اس کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتے۔ یہ دنیا، یہ کارزار حیات، یہ جہان جہد و عمل ہر انسان کے لئے یکساں وسیع ہے۔ کسی کا کوئی دائرہ نہیں، کوئی حد بندی نہیں۔ جہاں تک جس میں استعداد ہو اڑتا چلا جائے۔ کوئی روکنے والا نہیں۔ اس شاہراہ عمل پر کہیں یہ سائن بورڈ نہیں کہ "یہ راستہ عام نہیں"۔ یہاں ہر راستہ عام ہے۔ یہ شاہراہ کھلی ہوئی ہے جو کوشش کرے گا جتنی کوشش کریگا ہر اکتسابی شئے اس کے مطابق حاصل کرتا چلا جائے گا۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔ انسان کے لئے وہی ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے۔

پھر چونکہ کوئی تعلیم بلا عمل اور نمونہ کے مؤثر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے خود یہ

ثابت کر کے دکھلایا کہ فطرت نے ہر انسان کے لئے میدان سعی وعمل وسیع چھوڑا ہے، اور ایک ہی انسان مختلف کاموں میں ترقی کر سکتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے حضور کی پیدائش عرب کے ممتاز ترین خاندان میں ہوئی۔ لیکن ابتدائی پرورش اُس ماحول میں ہوئی جسے یہاں کی اصطلاح میں شُودر ورن کا ماحول کہنا چاہیئے۔ بکریاں چرانا، مویشی ہانکنا جو نیچ ذاتوں کا پیشہ قرار دیا گیا ہے اپنی زندگی کی ابتدا حضور نے اسی پیشہ سے کی اور اس وظیفہ زندگی کو اس حسن وخوبی سے انجام دیا کہ حضور کے ساتھی دوسرے بکریاں چرانے والے لڑکے تعجب کیا کرتے تھے۔ ہاشمی خاندان کے اس نونہال یا یوں کہیے کہ عرب کے سب سے اونچی گوت کے برہمن نژاد کو شودروں کے اس پیشہ سے قطعاً عار نہ تھا۔

تجارت اور بیوپار ویش ورن کا پیشہ کہا گیا ہے۔ یہ شودروں سے ذرا اونچے ہوتے ہیں حضور نے جب اگلا قدم اُٹھایا تو اپنے چچا کے ساتھ تجارت کے لیے جانا شروع کیا۔ نہیں۔ بلکہ خود تجارت شروع کی حضرت خدیجہؓ کا مال تجارت مدتوں بیچا۔ اور اس قدر کامیاب تاجر ثابت ہوئے کہ بڑے بڑے کہنہ مشق تجار انگشت بدنداں رہ گئے۔ اور حضور نے عملاً ثابت کر دیا کہ ایک شودر کا کام کرنے والا بچہ ویش کی سی تجارت بھی کر سکتا ہے۔

تیسرا ورن سورما سپاہی، کشتریوں کا ہے۔ میدان جنگ اُن کے لئے مخصوص ہے بساط سیاست کے یہ دھنی ہوتے ہیں حضور کی حیات مقدسہ میں جب نبرد آزمائی اور سیاست مدن کا شعبہ دیکھئے تو اس میں بھی آپ وحید ہیں کم وبیش تیس لڑائیوں میں حضور شریک ہوئے اور جرات وبسالت کا یہ عالم تھا کہ صحابہ کا بیان ہے کہ جب کبھی میدان جنگ میں عام سپاہیوں پر کڑا وقت آیا، ہم نے ہمیشہ حضور ہی کے پیچھے پناہ لی۔ کہیں شکست نہیں کھائی۔ کبھی پیٹھ نہیں دکھائی۔ عرب جیسے وحشی اور خونخوار ملک میں امن وسلامتی کے پرچم لہرا دیے اور خون کے اتنے کم چھینٹوں کے عوض کہ آج ایک فرقہ وارانہ فساد میں اس سے زیادہ خونریزی ہو جاتی ہے۔

پھر حکومت و سلطنت اس تدبر اور بلند نظری سے کی کہ دنیا بھر کے سیاست دان آج تک معترف ہیں۔ اس سے یہ بتا دیا کہ ہاں دیکھ لو، شودروں کے ماحول میں تربیت پانے والا بچہ، اگر کامیاب ویش ہوسکتا ہے تو کشتری بھی کم حیثیت کا نہیں ہوسکتا۔

اس سے آگے بڑھیے تو برہمنوں کا درجہ ہے اور یہ ورنوں کی تقسیم کے لحاظ سے گویا انسانیت کا آخری نقطہ ہے۔ یہ گیان اور ودیا اور علم و حکمت کے محافظ ہوتے ہیں۔ اس باب میں تو حضور کے متعلق کچھ عرض کرنا تحصیل حاصل ہے۔ دنیا بھر کے فلاسفر تمام جہاں کے عالم، بڑے بڑے منطقی، مشہور سائنسدان، اس نبی امی اعلم الناس، معلم الحکما، مدینۃ العلوم والحکم کے لائے ہوئے پیغام کے ایک ایک ٹکڑے کو لیتے ہیں اور جوں جوں اس کے حقائق بے نقاب ہوتے ہیں، وجد کرتے ہیں، جھومتے ہیں، اور آخر تھک کر بول اُٹھتے ہیں کہ

دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر ما ہمچنین در اول وصف تو ماندہ ایم

ابن رشد۔ بوعلی سینا۔ رازی۔ فارابی۔ جن کو آج یورپ اپنے اپنے فن کا امام مانتا ہے۔ اس مائدۂ علم و حکمت کے ریزہ چین، اور اس آفتاب حقایق و معارف کے مکتسب انوار تھے جن اساتذۂ علوم و فنون نے ساری دنیا کو تہذیب و تمدن سے روشناس کرایا وہ اس بکریاں چرانے والے تاجر امی سوداگری کرنے والے سپاہی اور اسی شمشیر افگن و ودان کے مکتب قدس کے ابجد خواں تھے۔ کیا اس سے بڑھکر دنیا کا کوئی مصلح، نوع انسانی کا کوئی ہمدرد، ایسا جامع نمونۂ زندگی پیش کرسکتا ہے، جس میں ہر ورن کے انسان، ہر گوت کے آدمی کے لئے امید و آرزو اور اطمینان و مسرت کا سامان موجود ہو؟ قرآن کریم نے کہا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (اے نوع انسانی) تمہارے لئے رسول اللہ کی زندگی میں ایک بہترین نمونہ ہے۔

حضورؐ تمام نوعِ انسانی کے لئے رسولؐ ہیں۔ کافۃ الناس کے لئے رہبر ہیں۔ اور خدا کے آخری پیغمبر ہیں۔ اس لئے حضور کی حیاتِ مقدسہ میں دنیا کے ہر طبقہ کے انسان کے لئے بہترین نمونہ ہونا چاہیئے کیا اس کے بعد انسان یہ کہہ سکتا ہے کہ میرے لئے ان نقوشِ قدم میں کوئی سامانِ رہنمائی نہیں؟ کیا ایک شودر اس بابِ عالی سے مایوس ہو کر جا سکتا ہے کہ میں ساری دنیا کا ٹھکرایا ہوا انسان امیدوں کی ہزاروں دنیائیں ساتھ لے کر یہاں پہنچا تھا۔ لیکن یہاں بھی میرے لئے پناہ کی جگہ نہیں! نہیں وہ رسولؐ ایک شودر کے لئے بھی ویسے ہی راہ نما ہیں جیسے ایک برہمن کے لئے۔ حضور نے عملاً بتلا دیا کہ شودر کو، ایک ویش کو، ایک کشتری کو کبھی یہ سمجھ کر مایوس نہیں ہو جانا چاہیئے۔ کہ ان کی ترقیوں کی دنیا انہی کے دائروں تک محدود ہے۔ نہیں! یہ دائرے حدود فراموش اور قیود نا آشنا ہیں۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا۔ ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے۔

—— (+) ——

پھر اس تعلیم و عمل کا دائرہ حضور کی ذاتِ گرامی تک ہی محدود نہ تھا۔ بلکہ مساواتِ نوعِ انسانی اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ اسی لئے جہاں جہاں اسلام تھا، وہیں اس عالمگیر اخوت و مساوات کے نظارے آنکھوں کے سامنے تھے۔ خود نبی اکرمؐ نے اپنی پھوپی زاد بہن یعنی عرب کے سب سے بڑے خاندان کی خاتون محترم کی شادی ایک غلام سے کر دی۔ غلام کی پوزیشن عرب جاہلیت میں یہاں کے شودروں سے بھی بدتر تھی۔ اس سے بڑھ کر مساوات کی اور کیا عملی مثال ہو سکتی ہے اسی کا نتیجہ تھا کہ اس سوسائٹی میں غلاموں کو وہ مدارج عالیہ حاصل ہوئے کہ احرار بھی ان کے سامنے ہیچ تھے۔ بلالؓ ایک ادنیٰ غلام تھے۔ خود جناب صدیق اکبرؓ نے انہیں آزاد کرایا۔ لیکن اسلام میں برہمنیت کی سب سے بلند کرسی پر یہی غلام فائز تھے۔ مؤذن رسول اللہ ہونے کا پہلا فخر انہی کو ہے۔ حالت یہ تھی کہ جب یہ دور سے نظر آتے تو حضرت ابو بکرؓ و حضرت علیؓ اٹھ کر کھڑے ہو جاتے کہ ہمارے

آقا بلالؓ آرہے ہیں۔ حضرت علی تو فرماتے ہیں کہ بلال خود میرے گھرانے کے ایک فرد ہیں۔ نبی اکرم نے جب آخری فوج تیار فرمائی تو اس میں قریش و عرب کے بڑے بڑے اکابر موجود تھے۔ صحابہ کبار مثل حضرات ابوبکر۔ عمر۔ علی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی جمع تھے لیکن فوج کی سپہ سالاری حضور نے ایک غلام زادہ۔ اسامہ بن زیدؓ کو تفویض فرما دی، اور کسی کی پیشانی پر بل تک نہیں آیا۔ کیا کوئی شودر اسے ممکنات میں سے تصور کر سکتا ہے کہ اس کو اتنا بلند درجہ بھی مل سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ پیدائش کے اعتبار سے بڑی اونچی ذات کے، پوزیشن کے لحاظ سے امیرالمومنین، لیکن اپنی نماز جنازہ کے لیے ایک رومی غلام، حضرت صہیبؓ کو تجویز فرمایا نہیں بلکہ ان سے درخواست کی کیا یہ سب سے بلند ترین مقام نہیں جو ایک برہمن کو مل سکتا ہے! وہی قریش جن کے نسبی تفاخر کا یہ عالم تھا کہ بدر کی لڑائی میں جب انصار کے چند سپاہی مقابلہ کے لیے نکلے تو انہوں نے ان سے اس بنا پر لڑنے سے انکار کر دیا کہ نسب اور پوزیشن کے لحاظ سے وہ ان سے کمتر ہیں۔ یہی قریش تھے کہ جب مسلمان ہوئے تو ایک مرتبہ حضرت بلالؓ نے شادی کی خواہش ظاہر کی تو بڑے بڑے قریشی متمنی تھے کہ وہ ان کے ہاں رشتہ پر راضی ہو جائیں حضرت عمرؓ کے عہد میں جب رجسٹرڈ مہاجرین و انصار کے وظائف مقرر ہوئے ہیں تو مشاہرہ کا معیار خاندان اور نسب پر نہ تھا بلکہ معیار یہ تھا کہ جو پہلے مسلمان ہوئے تھے ان کو سب سے زیادہ دیا جائے۔ اس کا عملی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ جس قدر غریب پیدائش کے لحاظ سے نیچی برادری کے لوگ تھے ان کو ممتاز حصہ ملا، اور قریش کے بڑے بڑے سردار، جو سب سے آخر مسلمان ہوئے تھے، سب سے فروتر رہے۔ اور آگے بڑھیے۔ یہ مثال صرف آپ کو اسلام میں ہی مل سکتی ہے کہ ہندوستان میں غلاموں نے اور مصر میں مملوکوں نے سلطنت کی۔ غلاموں کا بادشاہ ہو جانا کیا نوع انسانی کی تاریخ میں ورطۂ حیرت میں ڈالنے والا واقعہ نہیں؟ کیا شودروں کو اس سے بلند سطح کہیں اور بھی

مل سکتی ہے؟ آج جس کا جی چاہے جا کر دیکھ لے تقسیم عمل کے لحاظ سے عرب میں جو لوگ وہ کام کرتے ہیں جو یہاں شودروں سے مخصوص ہے، جب نماز کا وقت آتا ہے تو وہ مسجد حرام میں بڑے بڑے امراء اور اکابر سلطنت سے دوش بدوش، ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ اسلام کی وہی عالم آرا تعلیم فطرت۔ اور اس تعلیم کے مطابق نبی اکرم کا عملی نمونہ۔

آج وحدت انسانی کا ہر طرف چرچا ہے اخوت و مساوات کی ہر قلب سلیم کو تلاش ہے۔ انسانی استبداد و تغلب نے اپنے ہم جنس انسانوں کے پاؤں میں غلامی کی جو بوجھل زنجیریں مختلف نام رکھ کر ڈالی تھیں، انسانی فطرت انھیں توڑنے کے لیے خود بخود مجبور ہو رہی ہے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ ان غیر فطری قیود سے انسانیت کو آزاد کرانے کے لیے مختلف تحریکیں اٹھی ہیں۔ کئی آوازیں بلند ہوئی ہیں لیکن ہر وہ فطرت سلیم کا انسان جو بصارت کے ساتھ بصیرت بھی رکھتا ہے اگر ذرا غور و تعمق سے مطالعہ کرے، تو اس پر واضح ہو جائیگا کہ عملاً جس قسم کی مساوات کے نتائج اسلام نے پیدا کیے ہیں، اور کہیں پیدا نہیں ہو سکے۔ اس لیے کہ داعی اسلام کی بعثت کا سب سے اہم مقصد قرآن کریم نے انہی طوق و سلاسل کو توڑنا بتایا ہے، تاکہ حضور کی آمد سے فطرت انسانی پھر اسی آزادی کی فضا میں سانس لے سکے جو اس کی تخلیق کا مقصد ہے، اور خدا اور بندے کے درمیان کوئی تیسری قوت باقی نہ رہے۔ یہی تھے وہ رسول جن کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ۔

يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (۷: ۱۹)۔

وہ لوگوں کو نیکی کی تعلیم دے گا اور برائیوں سے روکیگا اور پاکیزہ چیزیں ان کے لیے حلال کریگا اور خبیث چیزیں ان پر حرام کریگا اور وہ بوجھ اور وہ طوق و سلاسل ان پر سے اتار پھینکے گا۔ (جن کے نیچے فطرت انسانی دبی چلی رہی تھی)

رسائل و مسائل

سود، پردہ، طلاق اور مہر

(۷)

قانون فطرت کو سمجھنے میں انسان کی کوتاہیاں صفحات گذشتہ میں خالص علمی تحقیق اور سائنٹفک مشاہدات و تجربات کی مدد سے ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اگر انسانی فطرت کے تمام مقتضیات اور انسان کی ذہنی افتاد اور جسمانی ساخت کی تمام دلالتوں کا لحاظ کر کے نظام تمدن میں عورت اور مرد کے باہمی تعلق کو ٹھیک ٹھیک توازن اور تناسب کے ساتھ مرتب کیا جائے، تو اس کے ضروری ارکان کیا ہونے چاہئیں۔ اس بحث میں کوئی چیز ایسی بیان نہیں کی گئی ہے جو متشابہات میں سے ہو، یا جس میں کسی کلام کی گنجائش ہو۔ جو کچھ کہا گیا ہے وہ علم و حکمت کے محکمات میں سے ہے اور عموماً سب ہی اہل علم و عقل اس سے واقف ہیں لیکن انسانی عجز کا کمال دیکھیے کہ جتنے نظام تمدن خود انسان نے وضع کیے ہیں ان میں سے ایک میں بھی فطرت کی ان معلوم و معروف ہدایات کو تمام و کمال اور بحسن تناسب ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انسان خود اپنی فطرت کے مقتضیات سے ناواقف نہیں ہے۔ اس سے خود اپنی ذہنی کیفیات اور جسمانی خصوصیات بھی پوشیدہ نہیں ہیں۔ مگر اس کے باوجود یہ حقیقت بالکل عیاں ہے کہ آج تک وہ کوئی ایسا معتدل نظام تمدن وضع کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا، جس کے اصول و مناہج میں پورے توازن کے ساتھ ان سب مقتضیات اور خصوصیات اور سب مصالح اور مقاصد کی رعایت کی گئی ہو۔

نارسائی کی حقیقی علت اس کی وجہ کیا ہے؟ انسان کی یہ فطری کمزوری کہ اس کی نظر کسی معاملے

کے تمام پہلوؤں پر من حیث الکل حاوی نہیں ہو سکتی۔ یہی افتادِ مزاج اور رجحانِ طبع کے لحاظ سے کوئی ایک پہلو اس کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، اور جب وہ ایک طرف مائل ہو جاتا ہے تو دوسرے اطراف یا تو اس کی نظر سے بالکل ہی اوجھل ہو جاتے ہیں یا وہ قصداً ان کو نظرانداز کر دیتا ہے۔ زندگی کے جزئی اور انفرادی معاملات تک میں انسان کی یہ کمزوری نمایاں نظر آتی ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ تمدن و تہذیب کے وسیع تر مسائل، جن میں سے ہر ایک اپنے اندر بے شمار جلی و خفی گوشے رکھتا ہے، اس کمزوری کے اثر سے محفوظ رہ جائیں۔ علم اور عقل کی دولت سے انسان کو ضرور سرفراز کیا گیا ہے، مگر زندگی کے معاملات میں خالص علم اور خالص عقلیت اس کی رہنما نہیں ہے۔ بلکہ جذبات اور رجحانات پہلے اس کو ایک رخ پر موڑ دیتے ہیں، پھر جب وہ اس خاص رخ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تب عقل سے استدلال کرتا اور علم سے مدد لیتا ہے۔ اس حالت میں اگر خود اس کا علم اس کو معاملے کے دوسرے رخ دکھائے اور اس کی اپنی عقل اس کی یک رُخی پر متنبہ کرے تب بھی وہ اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتا بلکہ علم و عقل کو مجبور کرتا ہے کہ اس کے رجحان کی تائید میں دلائل اور تاویلات فراہم کریں۔

چند نمایاں مثالیں | معاشرت کے جس مسئلے سے اس وقت ہم بحث کر رہے ہیں، اس میں بھی انسان کی یہی یک رُخی اپنی افراط و تفریط کی پوری شان کے ساتھ نمایاں ہوئی ہے۔

ایک گروہ اخلاق اور روحانیت کے پہلو کی طرف جھکا اور اس میں یہاں تک غلو کر گیا کہ عورت اور مرد کے صنفی تعلق ہی کو سرے سے ایک قابل نفرت چیز قرار دے بیٹھا۔ یہ بے اعتدالی ہم کو بودھ مت، مسیحیت اور بعض ہندو مذاہب میں نظر آتی ہے۔ اور اسی کا اثر ہے کہ اب تک دنیا کے ایک بڑے حصہ میں صنفی تعلق کو بجائے خود ایک بدی سمجھا جاتا ہے عام اس سے کہ وہ ازدواج کے دائرہ میں ہو یا اس سے باہر۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ کہ رہبانیت کی

غیر فطری اور غیر متمدن زندگی کو اخلاق اور طہارت نفس کا نصب العین سمجھا گیا۔ نوع انسانی کے بہت سے افراد نے جن میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں کو فطرت سے انحراف بلکہ جنگ میں ضائع کر دیا۔ اور جو لوگ اقتضائے فطرت سے مجبور ہو کر باہم ملے بھی تو اس طرح جیسے کوئی شخص مجبوراً اپنی کسی گندی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا تعلق نہ تو زوجین کے درمیان محبت اور تعاون کا تعلق بن سکتا ہے اور نہ اس سے کوئی صالح اور ترقی پذیر تمدن وجود میں آسکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ نظام معاشرت میں عورت کے مرتبہ کو گرانے کی ذمہ داری بھی بڑی حد تک اسی نام نہاد اخلاقی تصور پر ہے۔ رہبانیت کے پرستاروں نے صنفی کشش کو شیطانی وسوسہ، اور اس کشش کی محرک، یعنی عورت کو شیطان کا ایجنٹ قرار دیا، اور اس کو ایک ایسا ناپاک وجود ٹھیرایا جس سے نفرت کرنا ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے جو طہارت نفس چاہتا ہو۔ مسیحی یورپ اور ہندو لٹریچر میں عورت کا یہی تصور غالب ہے۔ اور اس تصور کے تحت جو نظام معاشرت مرتب کیا گیا ہو، اس میں عورت کا جیسا کچھ مرتبہ ہو سکتا ہے، اُس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔

اس کے برعکس دوسرے گروہ نے انسان کے داعیات جسمانی کی رعایت کی تو اس میں اتنا غلو کیا کہ فطرت انسانی تو در کنار، فطرت حیوانی کے مقتضیات کو بھی نظر انداز کر دیا۔ مغربی تمدن میں یہ کیفیت اس قدر نمایاں ہو چکی ہے کہ اب چھپائے نہیں چھپ سکتی۔ اس کے قانون میں زنا کوئی جرم ہی نہیں۔ جرم اگر ہے تو جبر و اکراہ ہے۔ یا کسی دوسرے شخص کے قانونی حق میں مداخلت۔ ان دونوں میں سے کسی جرم کی شارکت نہ ہو تو زنا، یعنی صنفی تعلقات کا ارتکاب بجائے خود کوئی قابل تعزیر جرم، حتیٰ کہ کوئی قابل شرم اخلاقی عیب بھی نہیں۔ یہاں تک تو وہ کم از کم حیوانی فطرت کی حمایت تھا لیکن اس کے بعد وہ اس سے بھی آگے بڑھا۔ اس نے صنفی تعلق کے حیوانی مقصد یعنی تناسل اور بقائے نوع کو بھی نظر انداز کر دیا، اور اسے محض جسمانی

لطف و لذت کا ذریعہ بنا لیا۔ یہاں پہنچ کر وہی انسان جو احسن تقویم پر پیدا کیا گیا تھا، اسفل سافلین میں پہنچ جاتا ہے۔ پہلے وہ اپنی انسانی فطرت سے انحراف کر کے حیوانات کا سا صنفی تعلق اختیار کرتا ہے جو کسی تمدن کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ پھر وہ اپنی حیوانی فطرت سے بھی انحراف کر کے اس تعلق کے فطری نتیجہ یعنی اولاد کی پیدائش کو بھی روک دیتا ہے تاکہ دنیا میں اس کی تہذیب، اس کے تمدن، اس کے علوم و فنون، اس کے نظام سیاست و معیشت، غرض اس کی کسی چیز کو بھی باقی رکھنے والی نسلیں ہی وجود میں نہ آنے پائیں۔

ایک جماعت نے خاندان کی اہمیت کو محسوس کیا تو اس کی تنظیم اس قدر سخت بندشوں کے ساتھ کی کہ ایک ایک فرد کو جکڑ کر رکھ دیا، اور حقوق و فرائض میں کوئی توازن ہی باقی نہ رکھا۔ اس کی ایک نمایاں مثال ہندوؤں کا خاندانی نظام ہے۔ اس میں عورت کے لیے ارادے اور عمل کی کوئی آزادی نہیں۔ تمدن اور معیشت میں کوئی حق نہیں۔ وہ لڑکی ہے تو لونڈی ہے۔ بیوی ہے تو لونڈی ہے۔ ماں ہے تو لونڈی ہے۔ بیوہ ہے تو لونڈی سے بھی بدتر زندہ درگور ہے۔ اس کے حصہ میں صرف فرائض ہی فرائض ہیں، حقوق کے خانے میں ایک عظیم الشان صفر کے سوا کچھ نہیں۔ اس نظام معاشرت میں عورت کو اتنا ہی نہیں کہ ایک بے زبان جانور بنانے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ اس میں سرے سے اپنی خودی کا ہی کوئی شعور پیدا نہ ہو۔ بلاشبہ اس طریقہ سے خاندان کی بنیادوں کو بہت مضبوط کر دیا گیا۔ اور عورت کی بغاوت کا کوئی امکان بھی باقی نہ رہا۔ لیکن جماعت کے پورے نصف حصہ کو ذلیل کر کے اس نظام معاشرت نے درحقیقت اپنی تعمیر میں خرابی کی ایک صورت، اور بڑی خطرناک صورت پیدا کر دی جس کے نتائج کو اب خود ہندو بھی محسوس کر رہے ہیں۔

ایک دوسری جماعت نے عورت کے مرتبے کو بلند کرنے کی کوشش کی اور اس کو

ارادہ و عمل کی آزادی بخشی تو اس میں اتنا غلو کیا کہ خاندان کا شیرازہ ہی درہم برہم کر دیا۔ بیوی ہے تو آزاد، بیٹی ہے تو آزاد، بیٹا ہے تو آزاد۔ خاندان کا درحقیقت کوئی سربراہ نہیں، کسی کو کسی پر اقتدار نہیں۔ بیوی سے شوہر نہیں پوچھ سکتا کہ تونے رات کہاں بسر کی، بیٹی سے باپ نہیں پوچھ سکتا کہ تو کس سے ملتی ہے اور کہاں جاتی ہے۔ زوجین درحقیقت دو برابر کے دوست ہیں جو مساوی شرائط کے ساتھ مل کر ایک گھر بناتے ہیں۔ اور اولاد کی حیثیت اس ایسوسی ایشن میں محض جونیر ممبرس کی سی ہے۔ مزاج اور طبائع کی ایک ادنیٰ ناموافقت اس بنے ہوئے گھر کو ہر وقت بگاڑ سکتی ہے، کیونکہ اطاعت کا ضروری عنصر، جو ہر نظم کو برقرار رکھنے کے لیے ناگزیر ہے، اس جماعت میں سرے سے موجود ہی نہیں۔ یہ مغربی معاشرت ہے، وہی مغربی معاشرت جس کے علمبرداروں کو اصول تمدن و عمران میں پیغمبری کا دعویٰ ہے۔ انکی پیغمبری کا صحیح حال آپ کو دیکھنا ہو تو یورپ اور امریکہ کی کسی عدالت نکاح و طلاق یا کسی عدالت جرائم اطفال (Juvenile Court) کی روداد اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ ابھی حال میں انگلستان کے ہوم آفس سے جرائم کے جو اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کم سن لڑکوں اور لڑکیوں میں جرائم کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے، اور اس کی خاص وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ خاندان کا ڈسپلن بہت کمزور ہو گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو Blue - book of Crime Statistics for 1934)

انسان اور خصوصاً عورت کی فطرت میں شرم و حیا کا جو مادہ رکھا گیا ہے اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے اور عملاً لباس اور طرز معاشرت کے اندر اس کی صحیح ترجمانی کرنے میں تو کسی انسانی تمدن کو کامیابی نہیں ہوئی۔ شرم و حیا کو انسان اور خاص کر عورت کی بہترین صفات میں سے شمار کیا گیا ہے۔ مگر لباس و معاشرت میں اس کا ظہور کسی عقلی طریقے اور کسی ہموار ضابطہ کی

صورت میں نہیں ہوا۔ ستر عورت کے صحیح حدود متعین کرنے اور یکسانی کے ساتھ ان کو ملحوظ رکھنے کی کسی نے کوشش نہیں کی۔ مردوں اور عورتوں کے لباس اور ان کے آداب و اطوار میں حیا داری کی صورتیں کسی اصول کے تحت مقرر نہیں کی گئیں معاشرت میں مرد اور مرد، عورت اور عورت، مرد اور عورت کے درمیان کشف و حجاب کی مناسب اور معقول حدبندی کی ہی نہیں گئی۔ تہذیب و شائستگی اور اخلاق عامہ کے نقطۂ نظر سے یہ معاملہ جتنا اہم تھا، اتنا ہی اس کے ساتھ تغافل برتا گیا۔ اس کو کچھ تو رسم و رواج پر چھوڑ دیا گیا، حالانکہ رسم و رواج اجتماعی حالات کے ساتھ بدل جانے والی چیز ہے، اور کچھ افراد کے ذاتی رجحان و انتخاب پر منحصر کر دیا گیا، حالانکہ نہ جذبۂ شرم و حیا کے اعتبار سے تمام اشخاص یکساں ہیں اور نہ ہر شخص اتنی سلامت ذوق اور صحیح قوت انتخاب رکھتا ہے کہ اپنے اس جذبہ کے لحاظ سے خود کوئی مناسب طریقہ اختیار کر سکے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مختلف جماعتوں کے لباس اور معاشرت میں حیا داری اور بے حیائی کی عجیب آمیزش نظر آتی ہے جس میں کوئی عقلی مناسبت، کوئی یکسانی، کوئی ہمواری، کسی اصول کی پابندی نہیں پائی جاتی۔ مشرقی ممالک میں تو یہ چیز صرف بے ڈھنگے پن ہی تک محدود رہی لیکن مغربی قوموں کے لباس اور معاشرت میں جب بے حیائی کا عنصر حد سے زیادہ بڑھا تو انہوں نے سرے سے شرم و حیا کی جڑ ہی کاٹ دی۔ ان کا جدید نظریہ یہ ہے کہ شرم و حیا، دراصل کوئی فطری جذبہ ہی نہیں ہے بلکہ محض لباس پہننے کی عادت نے اس کو پیدا کر دیا ہے۔ ستر عورت اور حیا داری کا کوئی تعلق اخلاق اور شائستگی سے نہیں بلکہ وہ تو درحقیقت انسان کے داعیات صنفی کو تحریک دینے والے اسباب میں سے ایک سبب ہے،[1]

[1] یہ لفظ بلفظ وہی خیال ہے جو Westermarck نے اپنی کتاب The History of Human Marriage میں ظاہر کیا ہے۔

اسی فلسفۂ بے حیائی کی عملی تفسیریں ہیں وہ نیم عریاں لباس، وہ جسمانی حسن کے مقابلے، وہ برہنہ ناچ، وہ ننگی تصویریں، وہ اسٹیج پر فاحشانہ مظاہرے، وہ برہنگی (Nudism) کی روز افزوں تحریک، وہ حیوانیت محض کی طرف انسان کی واپسی۔

یہی بے اعتدالی اس مسئلہ کے دوسرے اطراف میں بھی نظر آتی ہے۔ جن لوگوں نے اخلاق اور عصمت کو اہمیت دی انہوں نے عورت کی حفاظت ایک جاندار، ذی عقل، ذی روح وجود کی حیثیت سے نہیں کی بلکہ ایک بے جان زیور، ایک قیمتی پتھر کی طرح کی، اور اس کی تعلیم و تربیت کے سوال کو نظر انداز کر دیا، حالانکہ تہذیب و تمدن کی بہتری کے لیے یہ سوال عورت کے حق میں بھی اتنا ہی اہم تھا جتنا مرد کے لیے تھا۔ بخلاف اس کے جنہوں نے تعلیم و تربیت کی اہمیت کو محسوس کیا انہوں نے اخلاق اور عصمت کی اہمیت کو نظر انداز کر کے ایک دوسری حیثیت سے تمدن و تہذیب کی تباہی کا سامان مہیا کر دیا۔ اسی طرح جن لوگوں نے فطرت کی تقسیم عمل کا لحاظ کیا انہوں نے تمدن و معاشرت کی خدمات میں سے عورت پر صرف خانہ داری اور تربیت اطفال کی ذمہ داریاں عائد کیں اور مرد پر رزق مہیا کرنے کا بار ڈالا لیکن اس تقسیم میں وہ توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ انہوں نے عورت سے تمام معاشی حقوق سلب کر لیے۔ وراثت میں اس کو کسی قسم کا حق نہ دیا، ملکیت کے تمام حقوق مرد کی طرف منتقل کر دیے، اور اس طرح معاشی حیثیت سے عورت کو بالکل بے دست و پا کر کے عورت اور مرد کے درمیان درحقیقت لونڈی اور آقا کا تعلق قائم کر دیا۔ اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا گروہ اٹھا جس نے اس بے انصافی کی تلافی کرنی چاہی، اور عورت کو اس کے معاشی و تمدنی حقوق دلانے کا ارادہ کیا، مگر یہ لوگ ایک دوسری غلطی کے مرتکب ہو گئے، ان کے دماغوں پر مادیت کا غلبہ تھا اس لیے انہوں نے عورت کو معاشی و تمدنی غلامی سے نجات دلانے (Emancipation of Woman)

کے معنی یہ سمجھے کہ اس کو بھی مرد کی طرح خاندان کا کمانے والا فرد بنا دیا جائے، اور تمدن کی ساری ذمہ داریوں کو سنبھالنے میں مرد کے ساتھ برابر شریک کیا جائے۔ مادیت کے نقطۂ نظر سے اس طریقہ میں بڑی جاذبیت تھی۔ کیونکہ اس سے نہ صرف مرد کا بار ہلکا ہو گیا بلکہ کسب معیشت میں عورت کے شریک ہو جانے سے دولت کے حصول اور اسباب عیش کی فراہمی میں قریب قریب دوچند اضافہ بھی ہو گیا، مزید براں قوم کی معاشی اور عمرانی مشین کو چلانے کے لیے پہلے کے مقابلے میں دوگنے ہاتھ اور دوگنے دماغ مہیا ہو گئے جس سے یکایک تمدن کے ارتقاء کی رفتار تیز ہو گئی لیکن مادی اور معاشی پہلو کی طرف اس قدر حد سے زیادہ مائل ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے پہلو جو درحقیقت اپنی اہمیت میں اس ایک پہلو سے کچھ کم نہ تھے، ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور بہت سے پہلوؤں کو انہوں نے جانتے بوجھتے نظر انداز کر دیا۔ انہوں نے قانون فطرت کو جاننے کے باوجود قصداً اس کی خلاف ورزی کی جس پر خود انکی اپنی سائنٹفک تحقیقات شہادت دے رہی ہیں۔ انہوں نے عورت کے ساتھ انصاف کرنے کا دعوی کیا مگر درحقیقت بے انصافی کے مرتکب ہوئے جس پر خود ان کے اپنے مشاہدات اور تجربات گواہ ہیں۔ انہوں نے عورت کو مساوات دینے کا ارادہ کیا مگر درحقیقت نامساوات قائم کر بیٹھے جس کا ثبوت خود ان کے اپنے علوم و فنون فراہم کر رہے ہیں۔ انہوں نے تمدن و تہذیب کی اصلاح کرنی چاہی، مگر درحقیقت اس کی تخریب کے نہایت خوفناک اسباب پیدا کر دیے جن کی تفصیلات خود انہی کے بیان کردہ واقعات اور خود ان کے اپنے فراہم کردہ اعداد و شمار سے ہم کو معلوم ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ان حقائق سے بے خبر نہیں ہیں، مگر جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، یہ انسانی کمزوری ہے کہ وہ خود اپنی زندگی کے لیے قانون بنانے میں تمام مصلحتوں کی معتدل اور متناسب رعایت ملحوظ نہیں رکھ سکتا۔ ہوائے نفس اس کو افراط کے کسی ایک رخ پر بہالے جاتی ہے، اور جب وہ بہہ جاتا ہے تو بہت سی مصلحتیں اس کی نظر سے چھپ جاتی ہیں، اور بہت سی مصلحتوں اور حقیقتوں کو دیکھنے اور جاننے کے باوجود وہ ان کی

طرف سے آنکھیں بند کرلیتا ہے۔ اس قصدی و ارادی اندھے پن کے ثبوت میں ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتے کہ خود ایک ایسے اندھےؔ کی شہادت پیش کردیں۔ روس کا ایک ممتاز سائنس داں (Anton Nemilov) جو سو فیصدی کمیونسٹ ہے اپنی کتاب The Biological Tragedy of Woman) میں سائنس کے تجربات اور مشاہدات سے عورت اور مرد کی فطری نامساوات ثابت کرنے پر تقریباً دو سو صفحے سیاہ کرتا ہے، اور اس تمام سائنٹفک تحقیق کے بعد لکھتا ہے :۔

"آج کل اگر یہ کہا جائے کہ عورت کو نظام اجتماعی میں محدود حقوق دیے جائیں تو کم آدمی اس کی تائید کریں گے ہم خود اس تجویز کے سخت مخالف ہیں۔ مگر ہمیں اپنے نفس کو یہ دھوکہ نہ دینا چاہیے کہ مساواتِ مرد و زن کو عملی زندگی میں قائم کرنا کوئی سادہ اور آسان کام ہے۔ دنیا میں کہیں بھی عورت اور مرد کو برابر کردینے کی اتنی کوشش نہیں کی گئی جتنی سوویٹ روس میں کی گئی ہے۔ کسی جگہ اس باب میں اس قدر غیر متعصبانہ اور فیاضانہ قوانین نہیں بنائے گئے۔ مگر اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ عورت کی حقیقی پوزیشن خاندان میں بہت کم بدل سکی ہے۔"[۲]

نہ صرف خاندان میں بلکہ سوسائٹی میں بھی:۔

"اب تک عورت اور مرد کی نامساوات کا تخیل نہایت گہرا تخیل، نہ صرف ان طبقوں میں جو ذہنی حیثیت سے ادنیٰ درجہ کے ہیں، بلکہ اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ سوویٹ طبقوں میں بھی جما ہوا ہے، اور خود عورتوں میں اس تخیل کا اتنا گہرا اثر ہے کہ اگر ان کے ساتھ ٹھیٹھ مساوات کا سلوک کیا جائے تو وہ اس کو مرد کے مرتبہ سے گرا ہوا سمجھیں گی،

[۱] اس کتاب کا انگریزی ترجمہ لندن سے ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا ہے۔ [۲] کتاب مذکور صفحہ ۷۶۔

بلکہ اسے مرد کی کمزوری اور نامردی پر محمول کریں گی۔ اگر ہم اس معاملہ میں کسی سائنٹسٹ، کسی مصنف، کسی طالب علم، کسی تاجر، یا کسی سوفی صدی کمیونسٹ کے خیالات کا تجسس کریں تو بہت جلدی یہ حقیقت منکشف ہو جائیگی کہ وہ عورت کو اپنے برابر کا نہیں سمجھتا۔ اگر ہم زمانۂ حال کے کسی ناول کو پڑھیں، خواہ وہ کیسے ہی آزاد خیال مصنف کا لکھا ہوا ہو، یقیناً اس میں ہم کو کہیں نہ کہیں ایسی عبارتیں ملیں گی جو عورت کے متعلق اس تخیل کی چغلی کھا جائیں گی۔[۱]

اس کی وجہ؟

"اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں انقلابی اصول ایک نہایت اہم صورتِ واقعی سے ٹکرا جاتے ہیں، یعنی اس حقیقت سے کہ حیاتیات (Biology) کے اعتبار سے دونوں صنفوں کے درمیان مساوات نہیں ہے، اور دونوں پر مساوی بار نہیں ڈالا گیا ہے۔"[۲]

ایک اقتباس اور دیکھ لیجئے پھر نتیجہ آپ خود نکال لیں گے:۔

"سچی بات تو یہ ہے کہ تمام عمّال (Workers) میں صنفی انتشار (Sexual anarchy) کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں، یہ ایک نہایت پرخطر حالت ہے جو سوشلسٹ نظام کو تباہ کر دینے کی دھمکی دے رہی ہے۔ ہر ممکن طریقہ سے اس کا مقابلہ کرنا چاہیے، کیونکہ اس محاذ پر جنگ کرنے میں بڑی مشکلات ہیں۔ میں ہزارہا ایسے واقعات کا حوالہ دے سکتا ہوں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہوانی بے قیدی (Sexual licentiousness.) نہ صرف ناواقف

---

[۱] کتاب مذکور، صفحہ ۱۹۵-۱۹۴۔ [۲] کتاب مذکور صفحہ ۷۷۔

لوگوں میں بلکہ طبقۂ عمال کے نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور عقلی حیثیت سے ترقی یافتہ افراد میں بھی پھیل گئی ہے۔ۓ

ان عبارتوں کی شہادت کیسی کھلی ہوئی شہادت ہے۔ ایک طرف یہ اعتراف ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان خود فطرت نے مساوات نہیں رکھی، عملی زندگی میں بھی مساوات قائم کرنے کی کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں، اور جس حد تک فطرت سے لڑ کر اس قسم کی مساوات قائم کی گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فواحش کا ایک سیلاب امنڈ آیا جس سے سوسائٹی کا سارا نظام خطرہ میں پڑ گیا۔ دوسری طرف یہ دعویٰ ہے کہ نظام اجتماعی میں عورت کے حقوق پر کسی قسم کی حد بندیاں نہ ہونی چاہییں اور اگر ایسا کیا جائے گا تو ہم اس کی سخت مخالفت کریں گے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت اس امر کا ہوگا کہ انسان، جاہل نہیں عالم عاقل نہایت باخبر انسان بھی اپنے نفس کے رجحانات کا اتنا غلام ہوتا ہے کہ خود اپنی تحقیق کو جھٹلاتا ہے، اپنے مشاہدات کی نفی کرتا ہے، اور سب طرف سے آنکھیں بند کر کے ہوائے نفس کے پیچھے ایک ہی رخ پر انتہا کو پہنچ جاتا ہے خواہ اس افراط کے خلاف اس کے دل و دماغ کتنی ہی محکم دلیلیں پیش کریں، اس کے کان کتنے ہی واقعات سن لیں اور اس کی آنکھیں کتنے ہی بُرے نتائج کا مشاہدہ کر لیں۔ اَفَرَأَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ۔ (الجاثیہ: ۲۳)

قانون اسلام کی شان اعتدال بے اعتدالی اور افراط و تفریط کی اس دنیا میں صرف ایک نظام تمدن ایسا ہے جس میں غایت درجہ کا اعتدال اور توازن پایا جاتا ہے جس میں فطرت انسانی کے ایک ایک پہلو حتیٰ کہ نہایت خفی پہلو کی بھی رعایت کی گئی ہے۔ انسان کی جسمانی

ۓ کتاب مذکور صفحہ ۲۰۳ - ۲۰۲

ساخت اور اس کی حیوانی جبلت، اور اس کی انسانی سرشت، اور اس کی نفسی خصوصیات اور اس کے فطری داعیات کے نہایت مکمل اور تفصیلی علم سے کام لیا گیا ہے، اور ان میں سے ایک ایک چیز کی تخلیق سے فطرت کا جو مقصد ہے اُس کو تمام و کمال اس طریقہ سے پورا کیا گیا ہے کہ کسی دوسرے مقصد حتٰی کہ چھوٹے سے چھوٹے مقصد کو بھی نقصان نہیں پہنچا، پھر یہ سب مقاصد مل کر اُس بڑے مقصد کی تکمیل میں مددگار ہوتے ہیں جو خود انسانی زندگی کا مقصد ہے۔ یہ اعتدال، یہ توازن، یہ تناسب اتنا مکمل ہے کہ کوئی انسان خود اپنی عقل اور کوشش سے اس کو پیدا کرہی نہیں سکتا۔ انسان کا وضع کیا ہوا قانون، اور اس میں کسی جگہ بھی یک رخی نہ ظاہر ہو، ناممکن! قطعی ناممکن!! خود وضع کرنا تو درکنار حقیقت یہ ہے کہ معمولی انسان تو اس معتدل ومتوازن، اور انتہائی حکیمانہ قانون کو اچھی طرح سمجھ بھی نہیں سکتا۔ اگر کوئی غیر معمولی سلامت طبع رکھتا ہو، اور اس پر سالہا سال تک علوم اور تجربات کا اکتساب کرے، اور پھر برسوں غور وخوض کرتا رہے، تب وہ اس قابل ہو سکتا ہے کہ اُس کی حکمتوں کو سمجھے اور اس کے رموز پر مطلع ہو۔ یہی چیز ہم کو یقین دلاتی ہے کہ اس قانون کا واضع وہی ہے جو زمین کا فاطر اور غیب وشہادت کا عالم ہے، اور مختلف سمتوں میں بہک جانے والے بنی آدم کو عدل و توسط کا محکم طریقہ وہی بتا سکتا ہے۔ قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (الزمر: ۵)۔

اسلامی نظام معاشرت آئیے! اب اسلامی نظام معاشرت کے پورے نقشے پر ایک نظر ڈالیے اس کی حکمتوں اور اس کے اصول ومقاصد کو سمجھیے، اس کے ارکان اور ان کے باہمی تعلق کو دیکھیے، پھر یہ دیکھیے کہ ارکان کی باہمی ترکیب میں حجاب کا رکن کس طرح اور کس مصلحت سے نصب کیا گیا ہے، اگر اس ایک رکن کو ساقط کر دیا جائے تو اس سے دوسرے ارکان کی بندش پر کیا اثر

پڑتا ہے، اور اس رکن عظیم کو ہٹا دینے کے بعد کیا اس کی جگہ کوئی ایسا بدل تجویز کیا جا سکتا ہے جو اس پورے نظام معاشرت کو گرنے سے بچائے اور اس کے اصول و مقاصد میں سے کسی کو فوت نہ ہونے دے۔

قانون معاشرت کے مبادی| یہ بات اسلام کی خصوصیات میں سے ہے کہ وہ اپنے قانون کی حکمت پر بھی خود ہی روشنی ڈالتا ہے۔ چنانچہ معاشرت میں عورت اور مرد کے تعلقات کو منضبط کرنے کے لیے جو قانون اسلام میں پایا جاتا ہے اس کے متعلق بھی خود اسلام ہی نے ہم کو بتا دیا ہے کہ اس قانون کی بنیاد کن اصولِ حکمت اور کن حقائقِ فطرت پر ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی حقیقت جس کی پردہ کشائی کی گئی ہے، یہ ہے کہ۔

وَمِن كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (الذاریات) اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے پیدا کیے ہیں۔

یہ چیز حکمت کے غوامض اور حقائق اشیاء کے اسرار میں سے ہے۔ اس میں قانونِ زوجی (Law of sex) کی ہمہ گیری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کارگاہ عالم کا انجینیر خود اپنی انجینیری کا یہ راز کھول رہا ہے کہ اس نے کائنات کی یہ ساری مشین قاعدۂ زوجیت پر بنائی ہے یعنی اس مشین کے تمام کل پرزے جوڑوں (Pairs) کی شکل میں بنائے گئے ہیں۔ اس جہانِ خلق میں جتنی کاریگری تم دیکھتے ہو وہ سب انہی جوڑوں کی تزویج کا کرشمہ ہے۔ اب اس پر غور کرو کہ زوجیت کیا شے ہے۔ زوجیت میں اصل یہ ہے کہ ایک شئے میں فعل ہو اور دوسری شئے میں قبول و انفعال۔ ایک شئے میں تاثیر ہو اور دوسری شئے میں تاثر۔ ایک شئے میں عاقدیت ہو اور دوسری شئے میں منعقدیت۔ یہی عقد و انعقاد، اور فعل و انفعال، اور تاثیر و تاثر اور فاعلیت و قابلیت کا تعلق دو چیزوں کے درمیان زوجیت کا تعلق ہے۔ اسی تعلق سے تمام ترکیبات واقع ہوتی ہیں۔ اور انہی ترکیبات سے عالم خلق کا سارا کارخانہ چلتا ہے۔ کائنات میں جتنی چیزیں

ہیں وہ سب اپنے اپنے طبقہ میں زوج زوج اور جوڑ جوڑ کے طور پر پیدا ہوئی ہیں، اور ہر دو زوجین کے درمیان اصلی اور اساسی حیثیت سے زوجیت کا یہی تعلق پایا جاتا ہے کہ ایک فاعل ہے اور دوسرا قابل ومنفعل۔ اگرچہ مخلوقات کے ہر طبقے میں اس تعلق کی کیفیت مختلف ہو جاتی ہے، مثلاً ایک تزویج وہ ہے جو بسائط اور عناصر میں ہوتی ہے، ایک وہ جو مرکبات غیر نامیہ میں ہوتی ہے، ایک وہ جو اجسام نامیہ میں ہوتی ہے، ایک وہ جو انواع حیوانی میں ہوتی ہے۔ یہ سب تزویجیں اپنی نوعیت اور کیفیت اور فطری مقاصد کے لحاظ سے مختلف ہیں، لیکن اصلِ زوجیت ان سب میں وہی ایک ہے اور ہر نوع میں خواہ وہ کسی طبقہ کی ہو، فطرت کے اصل مقصد یعنی وقوع ترکیب اور ہیئت ترکیبی کے حصول کے لیے ناگزیر ہے کہ زوجین میں سے ایک میں قوت فعل ہو اور دوسرے میں قوت انفعال۔

آیت مذکورۂ بالا کا یہ مفہوم متعین ہو جانے کے بعد اس سے قانون زوجیت کے تین ابتدائی اصول مستنبط ہوتے ہیں:۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے جس فارمولے پر تمام کائنات کی تخلیق کی ہے اور جس طریقے کو اپنے اس کارخانہ کے چلنے کا ذریعہ بنایا ہے وہ ہرگز ناپاک اور ذلیل نہیں ہو سکتا بلکہ اپنی اصل کے اعتبار سے وہ پاک اور محترم ہی ہے اور ہونا چاہیے۔ کارخانہ کے مخالف اس کو گندہ اور قابل نفرت قرار دے کر اس سے اجتناب کر سکتے ہیں، مگر خود کارخانہ کا صانع اور مالک تو یہ کبھی نہ چاہے گا کہ اس کا کارخانہ بند ہو جائے۔ اس کا منشا تو یہی ہے کہ اس کی مشین کے تمام پرزے چلتے رہیں اور اپنے اپنے حصے کا کام پورا کریں۔

۲۔ فعل اور انفعال دونوں اس کارخانے کو چلانے کے لیے یکساں ضروری ہیں۔ فاعل اور منفعل دونوں کا وجود اس کارگاہ میں یکساں اہمیت رکھتا ہے۔ نہ فاعل کی حیثیت فعلی میں کوئی عزت ہے اور نہ منفعل کی حیثیت انفعالی میں کوئی ذلت۔ فاعل کا کمال یہی ہے کہ اس

میں قوت فعل اور کیفیات فاعلیہ پائی جائیں تاکہ وہ زوجیت کے فعلی پہلو کا کام بخوبی ادا کرسکے اور منفعل کا کمال یہی ہے کہ اس میں انفعال اور کیفیات انفعالیہ بدرجۂ اتم موجود ہوں تاکہ وہ زوجیت کے انفعالی اور قبولی پہلو کی خدمت باحسن وجوہ بجا لاسکے۔ ایک معمولی مشین کے پرزے کو بھی اگر کوئی شخص اس کے اصلی مقام سے ہٹا دے اور اس سے وہ کام لینا چاہے جس کے لیے وہ دراصل بنایا ہی نہیں گیا ہے، تو وہ احمق اور اناڑی سمجھا جائیگا۔ اول تو اپنی اس کوشش میں اسے کامیابی ہی نہ ہوگی، اور اگر وہ بہت زور لگائیگا تو بس اتنا کرسکے گا کہ مشین کو توڑ دے۔ ایسا ہی حال کائنات کی اس عظیم الشان مشین کا بھی ہے۔ جو احمق اور اناڑی ہیں وہ اس کے زوج فاعل کو زوج منفعل کی جگہ یا زوج منفعل کو زوج فاعل کی جگہ رکھنے کا خیال کرسکتے ہیں اور اس کی کوشش کرکے اور اس میں کامیابی کی امید رکھ کر مزید حماقت کا ثبوت بھی دے سکتے ہیں، مگر اس مشین کا صانع تو ہرگز ایسا نہ کرے گا۔ وہ تو فاعل پرزے کو فعل ہی کی جگہ رکھے گا، اور اسی حیثیت سے اس کی تربیت کرے گا۔ اور منفعل پرزے کو انفعال ہی کی جگہ رکھے گا اور اس میں انفعالی استعداد ہی کو پرورش کرنے کا انتظام کرے گا۔

۲ فعل اپنی ذات میں قبول و انفعال پر ایک فضیلت رکھتا ہے۔ یہ فضیلت عزت کے معنی میں نہیں ہے کہ انفعال اس کے مقابلہ میں ذلیل ہو، بلکہ یہ فضیلت دراصل غلبہ اور قوت اور اثر کے معنی میں ہے۔ جو شئے کسی دوسری شئے پر فعل کرتی ہے وہ اسی وجہ سے کرتی ہے کہ وہ اس پر غالب ہے، اس کے مقابلہ میں طاقت ور ہے اور اس پر اثر کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ اور جو شئے اس کے فعل کو قبول کرتی اور اس سے منفعل ہوتی ہے اس کے قبول و انفعال کی وجہ یہی ہے کہ وہ مغلوب ہے، اس کے مقابلہ میں کمزور ہے، اور متاثر ہونے کی استعداد رکھتی ہے۔

جس طرح وقوع فعل کے لیے فاعل اور منفعل دونوں کا وجود یکساں ضروری ہے، اسی طرح

یہ بھی ضروری ہے کہ فاعل میں غلبہ اور قوتِ تاثیر ہو اور منفعل میں مغلوبیت اور قبول اثر کی استعداد ہو، کیونکہ اگر دونوں قوت میں یکساں ہوں اور کسی کو کسی پر غلبہ حاصل نہ ہو تو ان میں سے کوئی کسی کا اثر قبول نہ کرے گا۔ اور سرے سے فعل واقع ہی نہ ہوگا۔ اگر کپڑے میں بھی وہی سختی ہو جو سوئی میں ہے تو سینے کا فعل پورا نہیں ہو سکتا۔ اگر زمین میں وہ نرمی نہ ہو جس کی وجہ سے وہ کدال اور ہل کا غلبہ قبول کرتی ہے تو زراعت اور تعمیر ناممکن ہے، غرض دنیا میں جتنے افعال واقع ہوتے ہیں، ان میں سے کوئی بھی واقع نہیں ہو سکتا اگر فاعل کے مقابلہ میں ایک منفعل نہ ہو اور منفعل میں فاعل کے اثر سے مغلوب ہونے کی صلاحیت نہ ہو۔ پس زوجین میں سے زوج فاعل کی طبیعت کا اقتضا یہی ہے کہ اس میں غلبہ اور شدت اور تحکم ہو جس کو مردانگی ورجولیت سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ فعلی پرزے کی حیثیت سے اپنی خدمت بجا لانے کے لیے اس کا ایسا ہی ہونا ضروری ہے۔ اس کے برعکس زوج منفعل کی فطرت انفعالیہ کا یہی اقتضا ہے کہ اس میں نرمی اور نزاکت اور لطافت اور تاثر ہو جسے انوثت یا نسائیت کہا جاتا ہے، کیونکہ زوجیت کے انفعالی پہلو میں یہی صفات اس کو کامیاب بنا سکتی ہیں جو لوگ اس راز کو نہیں جانتے وہ یا تو فاعل کی ذاتی فضیلت کو عزت کا ہم معنی سمجھ کر منفعل کو بالذات ذلیل قرار دے بیٹھتے ہیں یا سرے سے اس فضیلت کا انکار کر کے منفعل میں بھی وہی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو فاعل میں ہونی چاہئیں لیکن جس انجینیر نے ان دونوں پرزوں کو بنایا ہے وہ ان کو مشین میں اس طور پر نصب کرتا ہے کہ عزت میں دونوں یکساں اور تربیت و عنایت میں دونوں برابر مگر فعل و انفعال کی طبیعت جس غالبیت و مغلوبیت کی مقتضی ہے وہی ان میں پیدا ہو تاکہ وہ تزویج کے منشا کو پورا کر سکیں، نہ یہ کہ دونوں ایسے پتھر بن جائیں جو ٹکرا تو سکتے ہیں، مگر آپس میں کوئی امتزاج اور کوئی ترکیب قبول نہیں کر سکتے

یہ وہ اصول ہیں جو زوجیت کے ابتدائی مفہوم ہی سے حاصل ہوتے ہیں محض ایک مادی وجود ہونے کی حیثیت سے عورت اور

مرد کا زوج زوج ہونا ہی اس کا مقتضی ہے کہ ان کے تعلقات میں یہ اصول مرعی رکھے جائیں
چنانچہ آگے چل کر آپ کو معلوم ہوگا کہ فاطر السمٰوات والارض نے جو قانون معاشرت بنایا ہے
اس میں ان تینوں کی پوری رعایت کی گئی ہے۔

انسان کی حیوانی فطرت اور اس کے مقتضیات | اب ایک قدم آگے بڑھیے۔ عورت اور مرد کا وجود
محض ایک مادی وجود ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک حیوانی وجود بھی ہے۔ اس حیثیت سے ان کا زوج
زوج ہونا کس چیز کا مقتضی ہے؟ قرآن کہتا ہے :-

جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَمِنَ الْأَنْعَامِ أَزْوَاجًا يَذْرَؤُكُمْ فِيهِ (الشوریٰ) — اللہ نے تمہارے لیے خود تمہیں میں سے جوڑے بنائے اور جانوروں میں سے بھی جوڑے بنائے اس طریقہ سے وہ تم کو روئے زمین پر پھیلاتا ہے۔

نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ (بقرہ : ۲۸) — تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں۔

پہلی آیت میں انسان اور حیوان دونوں کے جوڑے بنانے کا ایک ساتھ ذکر کیا گیا
ہے اور اس کا مشترک مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے زوجی تعلق سے تناسل کا سلسلہ جاری ہو۔
دوسری آیت میں عام حیوانات سے الگ کرکے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ انواع حیوانات میں سے اس
خاص نوع کے زوجین میں کھیتی اور کسان کا سا تعلق ہے۔ یہ ایک حیاتی حقیقت Biological fact) ہے، اور حیاتیات کے نقطۂ نظر سے بہترین تشبیہ جو عورت اور مرد کو
دی جاسکتی ہے وہ یہی ہے۔ ان دونوں آیتوں سے تین مزید اصول حاصل ہوتے ہیں :

۱۔ اللہ تعالیٰ نے تمام حیوانات کی طرح انسان کے جوڑے بھی اس مقصد کے لیے بنائے
ہیں کہ ان کے صنفی تعلق سے انسانی نسل جاری ہو۔ یہ انسان کی حیوانی فطرت کا مقتضا ہے
جس کی رعایت ضروری ہے۔ خدا نے نوع انسانی کو اسلیے پیدا نہیں کیا ہے کہ اس کے چند افراد زمین

اپنے نفس کی پرورش کریں اور ختم ہو جائیں، بلکہ اس کا ارادہ ایک اجل معین تک اس نوع کو باقی رکھنے کا ہے۔ اور اس نے انسان کی حیوانی فطرت میں صنفی میلان اسی لیے رکھا ہے کہ اس کے زوجین باہم ملیں اور خدا کی زمین کو آباد رکھنے کے لیے اپنی نسل جاری کریں پس جو قانون خدا کی طرف سے ہوگا وہ صنفی میلان کو کچلنے اور فنا کرنے والا نہیں ہوسکتا، اس سے نفرت اور کلی اجتناب کی تعلیم دینے والا نہیں ہوسکتا، بلکہ اس میں لازماً ایسی گنجائش رکھی جائے گی کہ انسان اپنی فطرت کے اس اقتضا کو پورا کرسکے۔

۲۔ عورت اور مرد کو کھیتی اور کسان سے تشبیہ دیکر یہ بتایا گیا ہے کہ انسانی زوجین کا تعلق دوسرے حیوانات کے زوجین سے مختلف ہے۔ انسانی حیثیت سے قطع نظر، حیوانی اعتبار سے بھی ان دونوں کی ترکیب جسمانی اس طور پر رکھی گئی ہے کہ ان کے تعلق میں وہ پائداری ہونی چاہیے جو کسان اور اس کے کھیت میں ہوتی ہے۔ جس طرح کھیتی میں کسان کا کام محض تخم ریزی کر دینا نہیں ہے بلکہ اس امر کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس کو پانی دے، کھاد مہیا کرے، اور اس کی حفاظت کرتا رہے، اسی طرح عورت بھی وہ زمین نہیں ہے جس میں ایک جانور چلتے پھرتے کوئی بیج پھینک جائے، اور وہ ایک خودرو درخت اگا دے بلکہ جب وہ باروَر ہوتی ہے تو درحقیقت اس کی محتاج ہوتی ہے کہ اس کا کسان اس کی پرورش اور اس کی رکھوالی کا پورا بار سنبھالے۔

۳۔ انسان کے زوجین میں جو صنفی کشش ہے وہ حیاتی اعتبار سے اسی نوع کی ہے جو دوسری انواع حیوانی میں پائی جاتی ہے، ایک صنف کا ہر فرد صنف مقابل کے ہر فرد کی طرف حیوانی میلان رکھتا ہے، اور تناسل کا زبردست داعیہ جو ان کی سرشت میں رکھا گیا ہے، دونوں صنفوں کے ان تمام افراد کو ایک دوسرے کی طرف کھینچتا ہے جن میں تناسل

کی صلاحیت بالفعل موجود ہو۔ پس فاطر کائنات کا بنایا ہوا قانون، انسان کی حیوانی فطرت کے اس کمزور پہلو سے بے پروا نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس میں صنفی انتشار (Sexual anarchy) کی طرف ایسا شدید میلان چھپا ہوا ہے جو تحفظ کی خاص تدابیر کے بغیر قابو میں نہیں رکھا جا سکتا، اور ایک مرتبہ اگر وہ بے قابو ہو جائے تو انسان کو پورا حیوان بلکہ حیوانات میں بھی سب سے ارذل بن جانے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔

فطرت انسانی اور اس کے مقتضیات جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، طبیعت حیوانیہ، خلقت انسانی کی تہ میں زمین اور بنیاد کے طور پر ہے، اور اسی زمین پر انسانیت کی عمارت قائم کی گئی ہے۔ انسان کے جسم اور اس کی نوع کو باقی رکھنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے ان میں سے ہر ایک کی خواہش اور ہر ایک کے حصول کی استعداد اللہ تعالیٰ نے اس کی سرشت میں رکھ دی ہے، اور فطرت الٰہی کا منشا یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان خواہشات میں سے کسی خواہش کو پورا ہونے دیا جائے یا ان استعدادات میں سے کسی استعداد کو فنا کر دیا جائے کیونکہ یہ سب چیزیں بھی بہرحال ضروری ہیں اور ان کے بغیر انسان اور اس کی نوع زندہ نہیں رہ سکتی۔ البتہ فطرت جس بات کی متقاضی ہے، وہ یہ ہے کہ انسان اپنی ان خواہشات کو پورا کرنے اور ان استعدادات سے کام لینے میں حیوانی طریقہ نہ اختیار کرے، بلکہ اس کی انسانی سرشت جن امور کی مقتضی ہے، اور اس میں جن فوق الحیوانی امور کی طلب رکھی گئی ہے، ان کے لحاظ سے اس کا طریقہ انسانی ہونا چاہیے۔ اسی غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے حدود شرعی مقرر فرمائی ہیں، تاکہ انسان کے افعال کو ایک ضابطہ کا پابند بنایا جائے، اور اس کے ساتھ یہ تنبیہ کر دی گئی ہے کہ اگر افراط و تفریط کی صورت میں ان حدود سے تجاوز کرو گے تو اپنے آپ کو خود تباہ کر لو گے وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ

ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۔ (الطلاق: ۱)۔

اب دیکھیے کہ صنفی معاملات میں قرآن مجید انسانی فطرت کی کن خصوصیات اور کن مقتضیات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

(۱) دونوں صنفوں کے درمیان جس قسم کا تعلق انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے اس کی تشریح یہ ہے:۔

خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً (الروم: ۳) — اللہ نے تمہارے لیے خود تمہیں میں سے جوڑے بنائے ہیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو، اور اس نے تمہارے درمیان مودت اور رحمت رکھ دی ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (بقرہ) — وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔

اس سے پہلے جس آیت میں انسان اور حیوان دونوں کے لیے جوڑے بنانے کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا تھا وہاں تخلیق زوجین کا مقصد صرف بقائے نسل بتایا گیا تھا۔ اب حیوان سے الگ کر کے انسان کی یہ خصوصیت بتائی گئی ہے کہ اس میں زوجیت کا ایک بالاتر مقصد بھی ہے اور وہ یہ کہ ان کا تعلق محض شہوانی تعلق نہ ہو بلکہ محبت اور انس کا تعلق ہو۔ دل کے لگاؤ اور روحوں کے اتصال کا تعلق ہو۔ وہ ایک دوسرے کے رازدار اور شریک رنج و راحت ہوں، ان کے درمیان ایسی معیت اور دائمی وابستگی ہو جیسی لباس اور جسم میں ہوتی ہے۔ دونوں صنفوں کا یہی تعلق انسانی تمدن کی عمارت کا سنگ بنیاد ہے جیسا کہ ہم تفصیل بیان کر چکے ہیں۔ اس کے ساتھ لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا سے اس طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ عورت کی ذات میں مرد کے لیے سرمایۂ سکون و راحت ہے، اور عورت کی فطری خدمت یہی ہے کہ وہ اس جد و جہد اور ہنگامۂ عمل کی مشقتوں بھری دنیا میں سکون و راحت کا ایک گوشہ مہیا کرے۔ یہ انسان کی خانگی زندگی ہے جس کی اہمیت کو مادی منفعتوں کی خاطر اہل مغرب نے نظرانداز

کر دیا ہے، حالانکہ تمدن و عمران کے شعبوں میں جو اہمیت دوسرے شعبوں کی ہے وہی اس شعبے کی بھی ہے، اور تمدنی زندگی کے لیے یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنے دوسرے شعبے ضروری ہیں۔

(۲) یہ صنفی تعلق صرف زوجین کی باہمی محبت ہی کا مقتضی نہیں ہے بلکہ اس امر کا بھی مقتضی ہے کہ اس تعلق سے جو اولاد پیدا ہو اس کے ساتھ بھی ایک گہرا روحانی تعلق ہو۔ فطرتِ الٰہی نے اس کے لیے انسان کی اور خصوصاً عورت کی جسمانی ساخت اور حمل و رضاعت کی طبعی صورت ہی میں ایسا انتظام کیا ہے کہ اس کی رگ رگ اور ریشے ریشے میں اولاد کی محبت پیوست ہو جاتی ہے، چنانچہ قرآن مجید کہتا ہے۔

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ (لقمٰن : ۲) — اس کی ماں نے اس کو جھٹکے پر جھٹکے اٹھا کر پیٹ میں رکھا پھر دو سال کے بعد وہ ماں کی چھاتی سے جدا ہوا

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا (الاحقاف ۲) — اس کی ماں نے اس کو تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا، تکلیف کے ساتھ جنا اور اس کے حمل اور دودھ چھٹائی میں تیس مہینے صرف ہوئے۔

ایسا ہی حال مرد کا ہے، اگرچہ اولاد کی محبت میں وہ عورت سے کمتر ہے:۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ (آل عمران : ۲)۔ — لوگوں کے لیے خوش آیند ہے ان مرغوب چیزوں کی محبت جیسے عورتیں اور اولاد۔

یہی فطری محبت انسان اور انسان کے درمیان خونی اور صہری رشتے قائم کرتی ہے، ان رشتوں سے خاندان اور خاندانوں سے قبائل اور قومیں بنتی ہیں، اور ان کے تعلقات سے تمدن وجود میں آتا ہے:۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ — اور وہ خدا ہی ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا پھر

نَسَبًا وَّصِهْرًا ۔ (الفرقان : ۵) اس کو نسب اور شادی بیاہ کا رشتہ بنایا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَّ أُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا (الحجرات : ۲)

لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر تمہاری قومیں اور تمہارے قبیلے بنا دیئے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔

پس ارحام اور انساب اور مصاہرت کے رشتے دراصل انسانی تمدن کے ابتدائی اور طبعی مؤسسات ہیں اور ان مؤسسات کے قیام کا انحصار اس پر ہے کہ اولاد اپنے معلوم و معروف ماں باپ سے ہو اور انساب محفوظ ہوں۔

۳۔ انسانی فطرت کا اقتضا یہ بھی ہے کہ وہ اپنی محنتوں کے نتائج اور اپنی گاڑھی کمائی میں سے اگر کچھ چھوڑے تو اپنی اولاد اور اپنے ان عزیزوں کے لیے چھوڑے، جن کے ساتھ وہ تمام عمر خونی اور رحمی رشتوں میں بندھا رہا ہے۔

وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ ۔ (الانفال : ۱۰)۔

اور اللہ کے قانون میں رشتہ دار ایک دوسرے کی وراثت کے زیادہ حق دار ہیں۔

وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ (الاحزاب ۔ ۱)

جن کو تم منہ بولا بیٹا بنا لیتے ہو اُن کو خدا نے تمہارا بیٹا نہیں بنایا ہے۔

پس تقسیم میراث کے لیے بھی تحفظ انساب کی ضرورت ہے۔

۴۔ انسان کی فطرت میں حیاء کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے۔ اس کے جسم کے بعض حصے ایسے ہیں جن کے چھپانے کی خواہش خدا نے اس کی جبلت میں پیدا کی ہے، اور یہی جبلی خواہش ہے جس نے ابتدا سے انسان کو کسی نہ کسی نوع کا لباس اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے۔ اس باب میں قرآن قطعیت کے ساتھ جدید نظریہ کی تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی جسم کے جن حصوں میں مرد

اور عورت کے لیے صنفی جاذبیت ہے، ان کے اظہار میں شرم کرنا اور ان کو چھپانے کی کوشش کرنا، انسانی فطرت کا اقتضا ہے، البتہ شیطان یہ چاہتا ہے کہ وہ ان کو کھول دے۔

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُورِيَ عَنْهُمَا مِن سَوْآتِهِمَا... فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ مِن وَرَقِ الْجَنَّةِ (الاعراف: ۲)۔

پھر شیطان نے آدم اور ان کی بیوی کو بہکایا تاکہ ان کے جسم میں سے جو کچھ ان سے چھپایا گیا تھا اس کو ان پر ظاہر کردے.... پس جب انہوں نے اس شجر کا مزا چکھا تو ان پر ان کے جسم کے پوشیدہ حصے کھل گئے اور وہ ان کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے لگے

پھر قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے لباس اسی لیے اتارا ہے کہ وہ تمہارے لیے ستر پوشی کا ذریعہ بھی ہو اور زینت کا ذریعہ بھی مگر محض ستر چھپا لینا کافی نہیں، اس کے ساتھ ضروری ہے کہ تمہارے دلوں میں تقوی بھی ہو۔ قَدْ أَنزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَارِي سَوْآتِكُمْ وَرِيشًا وَلِبَاسُ التَّقْوَىٰ ذَٰلِكَ خَيْرٌ (الاعراف: ۳)۔

اسلامی نظم معاشرت کے ارکان یہ اسلامی نظام معاشرت کے اساسی تصورات ہیں۔ ان تصورات کو ذہن نشین کرنے کے بعد اب اس نظام معاشرت کی تفصیلی صورت ملاحظہ کیجیے جو ان تصورات کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے۔

ضابطۂ ازدواج تنظیم معاشرت کے سلسلہ میں سب سے اہم سوال، جیسا کہ ہم کسی دوسرے موقع پر بیان کر چکے ہیں، صنفی میلان کو انتشار عمل سے روک کر ایک ضابطہ میں لانے کا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر تمدن کی شیرازہ بندی ہی نہیں ہوسکتی، اور اگر ہو بھی جائے تو اس شیرازے کو بکھرنے اور انسان کو شدید اخلاقی و ذہنی انحطاط سے بچانے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ اس غرض کے لیے اسلام نے عورت اور مرد کے تعلقات کو مختلف حدود کا پابند کرکے ایک مرکز پر سمیٹ دیا ہے۔ وہ ان تمام

مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کیلیے حرام کرتا ہے جو باہم ملکر رہنے یا نہایت قریبی تعلقات رکھنے پر مجبور ہیں، مثلاً ماں اور بیٹا، باپ اور بیٹی، بھائی اور بہن، پھوپھی اور بھتیجا، چچا اور بھتیجی، خالہ اور بھانجا، ماموں اور بھانجی، سوتیلا باپ اور بیٹی، سوتیلی ماں اور بیٹا، ساس اور داماد، خسر اور بہو، سالی اور بہنوئی (بہن کی زندگی میں)، اور رضاعی رشتہ دار (سورۂ نساء، رکوع ۴)۔ ان تعلقات کی حرمت قائم کرکے ان کو صنفی میلان سے اس قدر پاک کردیا گیا ہے کہ ان رشتوں کے مرد اور عورت یہ تصوُّر بھی نہیں کرسکتے کہ وہ ایک دوسرے کی جانب کوئی صنفی کشش رکھتے ہیں (بجز ایسے خبیث طینت بہائم کے جن کی بہیمیت کسی اخلاقی ضابطہ کی حد میں رہنا قبول نہیں کرتی)۔ اس حد بندی کے بعد دوسری قید یہ لگائی گئی کہ ایسی تمام عورتیں بھی حرام ہیں جو بالفعل کسی دوسرے شخص کے نکاح میں ہوں (وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَاءِ (سورۂ نساء: ۴) ان کے بعد جو عورتیں باقی بچتی ہیں ان کے ساتھ بھی ہر قسم کے بے ضابطہ صنفی تعلق کو حرام کر دیا گیا ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَاءَ سَبِيْلًا۔ (بنی اسرائیل: ۴) — زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو کیونکہ وہ بے حیائی ہے اور بہت ہی برا چلن ہے۔

اس طرح حدود و قیود لگاکر صنفی انتشار کے تمام راستے بند کر دیے گئے مگر انسان کی حیوانی سرشت کے اقتضاء اور کارخانۂ قدرت کے مقرر طریقہ کو جاری رکھنے کے لیے ایک دروازہ کھولنا بھی ضرور تھا، سو وہ دروازہ نکاح کی صورت میں کھولا گیا، اور کہدیا گیا کہ اس ضرورت کو تم پورا کرو، مگر منتشر اور بے ضابطہ تعلقات میں نہیں، چوری چھپے بھی نہیں، کھلے بندوں بے حیائی کے طریقہ پر بھی نہیں، بلکہ باقاعدہ اعلان و اظہار کے ساتھ تاکہ تمہاری سوسائٹی میں یہ بات معلوم اور مسلّم ہو جائے کہ فلاں مرد اور عورت ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ ۔۔ ۔۔۔۔۔ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ ۔۔۔۔۔ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ (النساء: ۴)۔

ان عورتوں کے سوا جو عورتیں ہیں، تمہارے لیے حلال کیا گیا کہ تم اپنے اموال کے بدلے میں (مہر دے کر) ان سے احصان (نکاح) کا باضابطہ تعلق قائم کرو نہ کہ آزاد شہوت رانی کا ۔۔۔۔ پس ان عورتوں کے متعلقین کی رضامندی سے ان کے ساتھ نکاح کرو ۔۔۔۔۔ اس طرح کہ وہ قید نکاح میں ہوں نہ یہ کہ کھلے بندوں یا چوری چھپے آشنائی کرنے والیاں۔

یہاں اسلام کی شان اعتدال دیکھیے کہ جو صنفی تعلق دائرۂ ازدواج کے باہر حرام اور قابل نفرت تھا وہی دائرۂ ازدواج کے اندر نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے، کار ثواب ہے، اس کو اختیار کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، اس سے اجتناب کرنے کو ناپسند کیا جاتا ہے اور زوجین کا ایسا تعلق ایک عبادت بن جاتا ہے حتٰی کہ اگر عورت اپنے شوہر کی جائز خواہش سے بچنے کے لیے نفل روزہ رکھے، یا نماز و تلاوت میں مشغول ہو جائے تو وہ الٹی گنہگار ہو گی۔ اس باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چند حکیمانہ اقوال ملاحظہ ہوں:۔

علیکم بالباءۃ فانہ اغض للبصر و احصن للفرج فمن لم یستطع منکم الباءۃ فعلیہ بالصوم فان الصوم لہ وجاء (الترمذی ابواب النکاح۔ و فی ھذا المعنی حدیث فی کتاب النکاح للبخاری)۔

تم کو نکاح کرنا چاہیے کیونکہ وہ آنکھوں کو شرارت سے روکنے اور شرم گاہ کی حفاظت کرنے کی بہترین تدبیر ہے۔ اور جو شخص تم میں سے نکاح کی قدرت نہ رکھتا ہو اس کو روزہ رکھنا چاہیے کیونکہ روزہ شہوت کو دبانے والا ہے۔

واللہ انی لاخشاکم للہ واتقاکم لہ لکنی اصوم وافطر واصلی وارقد

بخدا کہ میں خدا سے ڈرنے اور اس کی ناراضی سے بچنے میں تم سب سے بڑھ کر ہوں، مگر مجھے

واتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔ (بخاری کتاب النکاح)۔	دیکھو کہ روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں نماز بھی پڑھتا ہوں اور راتوں کو سوتا بھی ہوں،

اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں یہ میرا طریقہ ہے اور جو میرے طریقہ سے اجتناب کرے اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔

لاتصوم المرأۃ وبعلها شاهد الا باذنه (بخاری باب صوم المرأۃ باذن زوجها)	عورت اپنے شوہر کی موجودگی میں اس کے اذن کے بغیر نفل روزہ نہ رکھے۔
اذا باتت المرأۃ مهاجرۃ فراش زوجها لعنتها الملائکۃ حتی ترجع (بخاری کتاب النکاح)۔	جو عورت اپنے شوہر سے اجتناب کرکے اس سے الگ رات گذارے اس پر ملائکہ لعنت بھیجتے ہیں جب تک کہ وہ رجوع نہ کرے۔
اذا رأی احدکم امرأۃ فاعجبته فلیأت اهله فان معها مثل الذی معها (ترمذی۔ باب ماجاء فی الرجل یری المرأۃ فتعجبه)	جب تم میں سے کوئی شخص کسی عورت کو دیکھ لے اور اس کے حسن سے متاثر ہو تو اپنی بیوی کے پاس چلا جائے کیونکہ اس کے پاس بھی وہی ہے جو اس کے پاس تھا۔

ان تمام احکام وہدایات سے شریعت کا منشاء یہ ہے کہ صنفی انتشار کے تمام دروازے مسدود کیے جائیں، زوجی تعلقات کو دائرۂ ازدواج کے اندر محدود کیا جائے، اس دائرہ کے باہر جس حد تک ممکن ہو کسی قسم کی صنفی تحریکات نہ ہوں، اور جو تحریکات خود طبیعت کے اقتضاء یا اتفاقی حوادث سے پیدا ہوں ان کی تسکین کے لیے ایک مرکز بنا دیا جائے، یعنی عورت کے لیے اس کا شوہر اور مرد کے لیے اس کی بیوی۔ اس طرح انسان تمام غیر طبعی اور خود ساختہ ہیجانات اور انتشار عمل سے بچ کر، اپنی مجتمع قوت (Conservated energy) کے ساتھ نظام تمدن کی

خدمت کرے، اور وہ صنفی محبت اور کشش کا مادّہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس کارخانے کو چلانے کے لیے ہر مرد و عورت میں پیدا کیا ہے، تمام تر ایک خاندان کی تخلیق اور اس کے استحکام میں صرف ہو۔ ازدواج ہر حیثیت سے پسندیدہ کیونکہ وہ فطرت انسانی اور فطرت حیوانی دونوں کے منشا اور قانون الٰہی کے مقصد کو پورا کرتا ہے، اور ترک ازدواج ہر حیثیت سے ناپسندیدہ، کیونکہ وہ دو برائیوں میں سے ایک برائی کا حامل ضرور ہوگا، یا تو انسان قانون فطرت کے منشا کو پورا ہی نہ کرے گا اور اپنی قوتوں کو فطرت سے لڑنے میں ضائع کردیگا، یا پھر وہ اقتضائے طبیعت سے مجبور ہو کر غلط اور ناجائز طریقوں سے اپنی خواہشات کو پورا کرے گا۔ (باقی)

مرآۃ المثنوی

مرتبہ

جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے رکن دارالترجمہ

مثنوی مولنا روم کا بہترین ایڈیشن جس میں مثنوی شریف کے منتشر مضامین کو ایک سلسلہ کے ساتھ اس طور پر مرتب کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا مولنا کے مدعا اور ان کی تعلیم کو بڑی آسانی سے سمجھتا چلا جاتا ہے۔ کئی انڈکس اور فہرستیں بھی ہیں جن کی مدد سے آپ حسب منشا جو شعر چاہیں نکال سکتے ہیں۔ ایک بسیط فرہنگ بھی ملحق ہے۔ غرض یہ کہ اس کتاب نے مثنوی شریف سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایسی سہولت مہیا کردی ہے کہ ایک شخص بڑی آسانی سے کتاب کے مطالب پر عبور حاصل کر سکتا ہے۔ کاغذ کتابت طباعت بہترین جلد نہایت اعلیٰ قیمت عہ سکہ انگریزی لعہ سکہ عثمانی

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجیے

مطبوعات

عقیدۂ اعجاز قرآن کی تاریخ تالیف ڈاکٹر عبدالحلیم صاحب پی ایچ ڈی (برلن) مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ قیمت ۸ر۔

یہ اُس مقالے کا ترجمہ ہے جس پر فاضل مؤلف کو برلن یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی سند ملی ہے۔ قرآن مجید کے متعلق معجزہ ہونے کا اعتقاد کن آیات سے پیدا ہوا ہے، کس طرح اس عقیدے کا نشوونما ہوا، کس کس دور میں کن کن لوگوں نے اس پر ضمناً یا مستقلاً بحث کی اور کن کن وجوہ و دلائل سے قرآن کو معجزہ قرار دیا، یہ مسائل ہیں جن پر ڈاکٹر صاحب نے نہایت مختصر مگر محققانہ بحث کی ہے۔ تحقیق قابل داد ہے، مگر اختصار اتنا ہے کہ اکثر مباحث تشنہ رہ گئے ہیں۔ انداز بیان اس درجہ "معروضی" ہے کہ کسی جگہ ظاہر ہی نہیں ہوتا کہ مؤلف خود بھی کسی مسئلہ میں کوئی رائے رکھتا ہے یا نہیں۔ "معروضیت" کی حد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے محمد اور رسول کے الفاظ لکھے ہیں جن پر غالباً کاتب نے کہیں کہیں صلعم بنا دیا ہے۔ صحابہ کرام کے حصہ میں علامت رضوان بھی نہ آئی۔ انہیں صرف ابو علی، عبداللہ بن زبیر وغیرہ لکھا گیا ہے۔ علمی تحقیق میں شخصی جذبات اور ذاتی رجحانات، اور ہر قسم کے تعصبات سے بالاتر رہنا ضروری ہے۔ مگر ایسی "معروضیت" جو "موضوعیت" سے سراسر ناآشنا ہو صرف فوٹو کے کیمرے اور ریکارڈنگ مشین ہی میں ہو سکتی ہے کہ لہ عین لا یبصر بھا و لہ اذن لا یسمع بھا و ما لاحد منھما بقلب۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ" میں اس "معروضیت" کا محل ہم نہیں سمجھ سکے۔ اس کو تو کسی سائنٹفک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ہونا چاہیے تھا۔ ا۔م

آخری نبی تالیف الیاس احمد صاحب مجیبی۔ مکتبۂ جامعہ۔ دہلی۔ قیمت ڈھائی آنہ۔

اس چھوٹے سے رسالہ میں مؤلف نے بہت چھوٹے بچوں کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے

حالات بالکل کہانی کے انداز میں لکھے ہیں۔ زبان اس قدر سہل ہے کہ ہر بچہ اس کو سمجھ سکتا ہے رسالہ یہ اس قابل ہے کہ جیسے بچے میں تھوڑی سی سمجھ آجائے تو اس کے ماں باپ یا بہن بھائی اس کو پڑھ کر سنائیں تاکہ ابتدا ہی سے اس کے دل میں سرکار رسالتمآب کی محبت اور عظمت جاگزین ہوجائے۔ ا م

چار یار | تالیف الیاس احمد صاحب مجیبی۔ مکتبہ جامعہ ملیہ۔ دہلی۔ قیمت ۶ ر

یہ رسالہ بھی بچوں کے لیے لکھا گیا ہے اور اس میں حضرات خلفاء راشدین کے حالات نہایت سبق آموز اور سہل انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ بعض اسلامی درسگاہوں میں اس کو ابتدائی جماعتوں کے نصاب میں داخل کرلیا گیا ہے۔ ا۔ م

دس جنتی | تالیف الیاس احمد صاحب مجیبی۔ مکتبہ جامعہ۔ دہلی۔ قیمت ۵ ر

اس رسالہ میں حضرات خلفاء راشدین کے ساتھ حضرت زبیر، حضرت طلحہ، حضرت عبد الرحمٰن ابن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح، اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہم کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ بھی بچوں میں اپنے بزرگوں سے واقفیت اور ان کی پیروی کا شوق اور دین کی محبت پیدا کرنے کے لیے نہایت مفید چیز ہے۔ ا۔ م۔

The Messag of Islam | تالیف فضل کریم خاں صاحب درانی بی اے، ایڈیٹر "ثروت" دفتر اخبار "ثروت"۔ لاہور۔ قیمت فی نسخہ ۶ ر۔ چار نسخوں کے لیے عہ نو نسخوں کے لیے ۲ روپیہ۔

انگریزی زبان میں ہندوستان کی اچھوت قوموں کے لیے خصوصاً اور دوسرے غیر مسلموں کے لیے عموماً، اسلام کی جانب ایک دعوت عام ہے۔ فاضل مؤلف نے بحسن خوبی کے ساتھ تعلیمات اسلامی کی روح اور تمام مذہبی نظاموں پر اسلام کی برتری ظاہر کی ہے قابل دہی۔ بیان نہایت مختصر۔ مدلل ہے۔ زبان نہایت مؤثر اور پر زور ہے۔ آسان کم الفاظ میں اسلام کا اتنا اچھا تعارف اب تک کم از کم انگریزی زبان میں ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ آخر میں مؤلف نے بڑی خوبی کے ساتھ یہ حقیقت اچھوتوں کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کی اور ہندوستان کی نجات کا راستہ بجز قبول اسلام کے اور کوئی نہیں۔ اس رسالہ کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ا م

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۲۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا مہینہ کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام طویل مدت کے لیے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہیے ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹری نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز

اشاعت کے لیے مضامین و مطالب کل تمام ایڈیٹر کے نام بھیجے جائیں لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں کہ ہر چیز شائع کرے

مینیجر ترجمان القرآن بدر الدین بلڈنگ نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

(طابع و ناشر سید ابو الاعلیٰ مودودی) (مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن)

اُردو زبان کی ایک پُرشکوہ کتاب

تمدنِ عرب

جو مدتوں سے نایاب تھی پہلے اڈیشن ۱۸۹۸ء

کی صحیح جامع مع خصوصیات کے ساتھ طبع ہو رہی ہے (۱۴۵) امریکن بلاک (۱۵۱) صفحے اعلیٰ کاغذ نفیس چھپائی بہترین سنہری جلد فرانس کے مایۂ ناز مورخ ڈاکٹر گستاؤلی بان کی اصل کتاب کا ترجمہ

مولوی سید علی بلگرامی مرحوم کا بے مثل علمی کارنامہ

جس کی پچاس روپیہ قیمت تھی مگر ایک سو روپیہ میں بھی نہیں مل سکتی تھی

اعلیٰحضرت فرمانروائے دکن (مد ظلہ) کے

جشن سیمین کی شادمانی میں غرۂ ذی حجہ سنہ ۱۳۵۴ھ تک شائع ہو جائے گی

پیشگی رعایتی قیمت دس روپے بعد طبع پچیس روپے

جامعہ عثمانیہ کی جملہ مطبوعات ہر قسم کی نادر روزگار کتابوں کے لیے

سید عبد القادر

پبلشر گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز و پروپرائٹر اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن کا (پتہ یاد رکھیں)